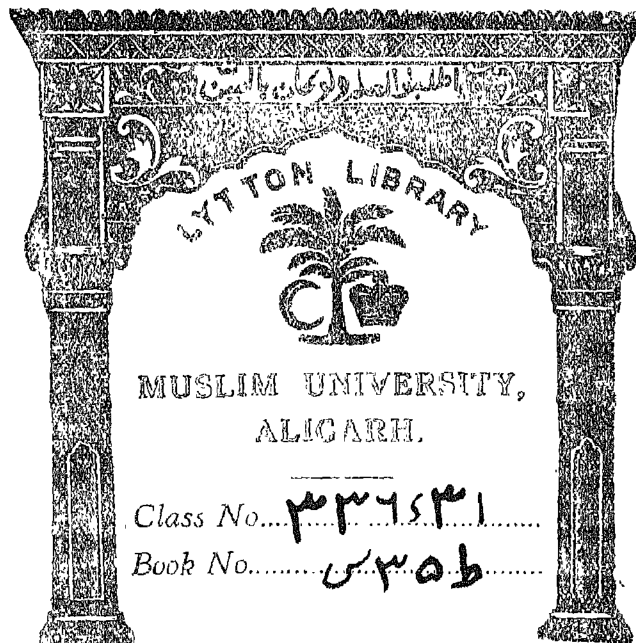

LYTTON LIBRARY
MUSLIM UNIVERSITY,
ALIGARH.
Class No. ۳۳٦،۳۱
Book No. ۳۵ط س

یہ کتاب ایک مسلمان کے لئے بہت فائدہ مند ہے اگر کوئی مسلمان اپنے مستقبل کو اچھا
بنانا چاہتا ہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ دینی کتب کا مطالعہ کرے

[illegible]

علیکم بالتجارۃ فان فیہا تسعۃ اعشار الرزق

مسئلہ سود



اور

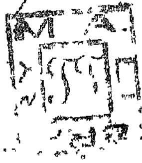
مسلمانوں کا مستقبل

یعنی

تجارتی، صنعتی، اقتصادی، اور کاروباری کامیابی کا راز، اور مسلمانوں کو تباہی و بربادی کے گرداب سے نکالنے کی تدبیر

مدونہ

سید طفیل احمد (علیگ) متوطن منگلور ضلع سہارنپور وارد حال ولایت منزل علی گڈھ



نظامی پریس بدایوں میں چھپا

(نظام الدین حسین پرنٹر)

JKKhan

گذارش

نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا بھر کے مسلمان جس سرعت کے ساتھ قعرِ ذلت میں گر رہے ہیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ انھیں اس حالت سے نکالنے کے لیے تمام امکانی تدابیر عمل میں لائی جا رہی ہیں مگر کوئی بہتری کی صورت نہیں نکلتی۔ اس خوفناک حالت سے متاثر ہو کر میں نے اس رسالہ میں مسئلہ سود پر جس کے حل ہونے پر میرے نزدیک مسلمانوں کی قومی زندگی کا مدار ہے بحث کی ہے۔ اس مضمون پر یہ پہلی کتاب نہیں ہے بلکہ متعدد کتابیں اس بارہ میں شایع ہوئی ہیں جن میں سے چند مجھے دستیاب ہو سکی ہیں اور اُن سے مجھے اس رسالہ کے مرتب کرنے میں مدد ملی ہے۔ اور اسلیے میں اُن کے مصنفین کا تہ دل سے ممنون ہوں۔ ان کتابوں کی فہرست مع مفصل پتوں کے ذیل میں درج کی جاتی ہے تاکہ جو اصحاب اس مسئلہ کے متعلق معلومات حاصل کرنا پسند کریں اور ان خیالات کی اشاعت کرنا چاہیں وہ انھیں منگا سکیں۔ اگرچہ خیال یہ ہے کہ ان میں سے بعض کا ملنا دشوار ہوگا۔ اسی کے ساتھ میری یہ استدعا ہے کہ اگر کسی صاحب کو اس مضمون کا کوئی اور رسالہ معلوم ہو تو اس کے پتے سے از راہ کرم مجھے مطلع فرمائیں تاکہ اگر ممکن ہو تو اس سلسلہ کی کتابوں کی اشاعت کی کوشش کی جائے اور تجارت و کاروبار کے لٹریچر کو مسلمانوں میں شایع کیا جائے۔ سر دست اس رسالہ کی ایک ہزار کاپیاں طبع ہوئی ہیں اکثر اصحاب کی خدمت میں اس کتاب کی جلدیں ہدیۃً ارسال ہونگی اور جس قدر فروخت ہو سکیں گی اُن کی قیمت سے آئندہ اشاعت کا سلسلہ جاری کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

رسالہ ہذا کے متعلق اگر کوئی صاحب مخالفانہ یا موافقانہ خیالات کا اظہار فرمائیں تو ازراہ کرم

(الف)

فہرست مضامین

نمبر سلسلہ		صفحہ	نمبر سلسلہ		صفحہ
۱	تمہید	۱	۱۴	دولت اور اصل کا فرق	۱۲
	باب اول سود کی دنیوی تاریخ		۱۵	بینک ذریعہ تجارت	۱۴
	فصل اول۔ زمین		۱۶	بیمہ	۱۵
۲	مختلف اقوام میں سود خوری کی ممانعت	۴		باب دوم	
۳	ارسطو کا قول	۵		سود کی مذہبی تاریخ	
۴	اشیاء کا کرایہ	۶	۱۷	مذہب یہود میں سود	۱۶
۵	سود جاری ہونے کی وجہ	″	۱۸	مذہب یہود میں سود	۱۷
۶	بڑی عزت حکومت میں تھی	۷	۱۹	مذہب عیسوی میں سود	″
۷	انگلستان میں سود کی ممانعت	″		باب سوم	
	فصل دوم۔ محنت			مذہب اسلام میں سود	
۸	صنعت و حرفت	۸		فصل اول۔ ربا	
	فصل سوم۔ سرمایہ		۲۰	ربا الجاہلیت	۱۸
۹	بنک کی ابتدا	۹	۲۱	معین منافع پر مضاربت کا جواز	۲۱
۱۰	بنک کا اثر شرح سود پر	۱۰	۲۲	تجارتی سود کا جواز قرآن شریف سے	۲۴
۱۱	قانون سود کی ترمیم کا مسودہ	″	۲۳	آیۂ تجارتی سود کی تشریح	۲۶
۱۲	ربوا اور بیع میں فرق	۱۱	۲۴	دیگر آیات ربوا پر نظر	۲۸
۱۳	[illegible] حاجت بہ	″	۲۵	بنک وغیرہ سے استفادہ	۳۰

صفحہ	مضمون	نمبر
۳۱	انفرادی دادوستد	۲۶
	فصل دوم۔ ربا الفضل	
״	تعریف ربا الفضل میں اختلافات	۲۷
۳۴	ربا الفضل کی حرمت کی وجہ	۲۸
۳۵	ہنڈوی کی نسبت شاہ عبدالعزیز صاحب کا فتویٰ	۲۹
۳۹	چاندی وغیرہ کی خرید و فروخت کا جواز	۳۰
	فصل سوم۔ ربوا فی دار الحرب	
۴۱	ربا کی تنہا ناجائز صورت	۳۱
۴۲	دار الحرب کی تعریف	۳۲
۴۴	ہندوستان میں ربا کے جواز کی نسبت شاہ عبدالعزیز صاحب کا فتویٰ	۳۳
۴۶	دار الحرب میں جواز ربا کی مصلحت	۳۴
۴۷	زمانہ سابق کی بلا کرایہ اشیا	۳۵
	باب چہارم مسلمانوں کا مستقبل	
۴۸	اقتصادی کے کچھ اعداد	۳۶
	فصل اول مختلف پیشوں میں مسلمانوں کا انحطاط	
۵۱	زمینداری و کاشتکاری	۳۷

صفحہ	مضمون	نمبر
۵۳	صنعت و حرفت	۳۸
۵۶	تجارت	۳۹
۵۸	ملازمت	۴۰
	فصل دوم مجوزہ علاجات کی ناکامی	
۶۰	تعلیم	۴۱
۶۴	مذہب	۴۲
۶۹	اصلاح تمدن	۴۳
۷۱	موجودہ مایوسانہ حالت	۴۴
	فصل سوم۔ تدابیر	
۸۱	افلاس کی دلدل سے نکلنا	۴۵
۸۶	۱۔ ترویج سود کی انجمن قائم کرنا	
۸۷	۲۔ طلبا کو کفایت شعاری پر انعامات دینا	
״	۳۔ مشترک سرمایہ کی کمپنیاں قائم کرنا	
۸۸	۴۔ زر کا کاروبار کرنا	
״	۵۔ زندگی کا بیمہ کرانا	
۸۹	۶۔ بیوپار کی تعلیم دینا	
״	۷۔ [illegible] طلبا کو تجارت کی ترغیب دینا	
۹۰	خاتمہ	۴۶



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تمہید

مسلمانوں میں سود کا مسئلہ ابتدائے اسلام سے غیر منفصل رہا ہے چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ تعالے عنہ نے فرمایا تھا خَرَجَ رَسُولُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مِنَ الدُّنْیَا وَمَا سَأَلْنَاہُ عَنِ الرِّبٰوا یعنی آنحضرت صلعم انتقال فرما گئے۔ اور ہم نے ان سے ربوا کے معنی نہ پوچھے۔ ربوا کے معنی نہ پوچھ سکنے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے، کہ حرمت ربوا کی آیت کے نزول کے بعد صرف نو دن آنحضرتؐ زندہ رہے۔ اس امر کو قسطلانی نے ابن جبیرؓ سے نقل کیا ہے۔ آنحضرت کی وفات کے بعد سے ربوا کے مسئلہ میں مختلف اوقات میں تحقیق و تدقیق ہوتی رہی۔ مگر کسی امر پر اجماع نہ ہو سکا لیکن اجماع نہ ہونے سے پہلے زمانہ میں کوئی حرج بھی محسوس نہ ہوتا تھا کیونکہ قومی سلطنت ہونے سے مسلمانوں کیلئے معاش کی راہیں کھلی تھیں۔ اور وہ روپیہ کو سود پر چلانے پر مجبور نہ تھے۔ مگر ہندوستان میں مسلمانوں کی سلطنت کے خاتمہ کے بعد جب ملک میں تجارت اور روپیہ کی دادوستد کا دور دورہ ہوا تو جدید حالات سے متاثر ہو کر حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ محدث دہلوی نے اس مسئلہ کی طرف توجہ فرمائی اور خاص صورتوں میں جواز ربوا کے فتوے دے۔ مگر ایک دو فتوے مسلمانوں کے صدیوں کے پرانے طرز عمل کو کیا بدل سکتے تھے۔ انھوں نے اسراف کے طریقوں اور سودی قرضہ لینے کے عادات کو بدستور قائم رکھا جس سے ان کی مفلسی بڑھتی گئی۔ اس حالت کو دیکھکر مولوی محمد الفضاء اللہ خاں صاحب

مالک اخبار وطن لاہور نے قومی تجارت کو فروغ دینے اور سود و ربوا کے مسئلہ کو صاف کرنے کے لیے ۱۹۰۸ء
میں وطن میں مضامین کا ایک سلسلہ شایع کیا۔ اس کے بعد زمینداروں کی حد درجہ بربادی دیکھ کر ۱۹۱۱ء
میں جناب مولوی محمد حسن صاحب متوطن ایمن آباد ضلع جہلم نے ایک رسالہ بنام روض الربی فی حقیقۃ الربوا شایع
کیا اور اسی سال مسئلہ سود پر علما مصر کے لیکچروں کا ترجمہ مولوی محمد نذیر صاحب نے لاہور سے شایع کیا۔
ان کے علاوہ اور اصحاب نے بھی متعدد رسالے اس مضمون پر شایع کیے مگر انہی کوششوں پر بھی سود کی
کوئی ایسی صورت قرار نہ پائی جو مسلمانوں میں عام طور پر معیوب نہ سمجھی جاتی ہو حتی کہ تجارتی سود اور
بنک کے سود بھی اب تک مشتبہ نظروں سے دیکھے جاتے ہیں۔

آنحضرت رسول اللہ صلعم کا ارشاد ہے عَلَيْكُمْ بِالتِّجَارَةِ فَإِنَّ فِيهَا تِسْعَةَ أَعْشَارِ الرِّزْقِ
یعنی یہ کہ لازم پکڑو تم تجارت کو اس لیے کہ اس میں ۹/۱۰ حصہ معاش کا ہے۔ اس حدیث پر واقعی طور پر اس
زمانہ میں دنیا کی زندہ اور متمدن اقوام کا عمل ہے جن کا سرمایہ نہ صرف اپنے ملکوں میں بلکہ دیگر ممالک میں
تجارت اور کارخانوں میں لگا ہوا ہے حتی کہ بعض سلطنتیں مثل امریکہ وغیرہ کے تجارت، صنعت و حرفت
کے مقابلہ میں ملک گیری کو ہیچ سمجھتی ہیں۔ مگر جس قسم کی تجارت آج کل دنیا میں رائج ہے وہ چونکہ
بغیر تجارتی سود کے چل نہیں سکتی۔ اس لیے مسلمان بحیثیت قوم کے تجارت کے پیشے سے علحدہ
ہیں۔

مثلاً یہ کہ کسی ملک سے مال منگایا جائے تو مال منگانے والے کو مال کی روانگی کے وقت سے
مال کی قیمت پر سود دینا پڑتا ہے۔ خواہ وہ مال ہفتوں میں پہنچے یا مہینوں میں۔ اس کے مقابلہ میں
مسلمان جن لوگوں کو ادھار مال دیتے ہیں ان سے وہ سود نہیں لے سکتے۔
دیگر یہ کہ تجارت پیشہ اشخاص جو لاکھوں روپیہ کا بیوپار کرتے ہیں ان کا اپنے گھروں میں زیادہ
روپیہ رکھنا خطرہ سے خالی نہیں ہوتا اس لیے وہ بنکوں میں روپیہ رکھتے ہیں۔ ان میں سے جو تاجر
مسلمان نہیں ہیں وہ تو بنکوں سے زرامانت کا سود خفیف شرح پر پاتے ہیں مگر جو مسلمان تاجر ہیں
[illegible] لاکھوں روپیہ بنکوں میں بلاسودی رکھتے ہیں اور جب خود انھیں روپیہ کی ضرورت ہوتی ہے

تو انھیں بینکوں سے سود پر قرض لیتے ہیں۔ ان طریقوں سے مسلمانوں کو تجارت میں قدم قدم پر نقصانات اٹھانے پڑتے ہیں جن کی وجہ سے وہ تجارت کے شریف پیشے سے جس کو اختیار کرنے کی حدیث شریف میں ہدایت ہے عملاً خارج ہو گئے ہیں۔

زمینداری اور تجارت کے علاوہ آج کل صنعت و حرفت، کسب معاش کا عمدہ ذریعہ ہے مگر اس کا نفع بھی انھیں لوگوں کے ہاتھوں میں پہونچتا ہے جو سرمایہ دار ہیں۔ اور سرمایہ صرف ان لوگوں کا حصہ ہے جو روپیہ کا استعمال کرایہ یا منافع لینا جائز سمجھتے ہیں۔ اس وقت ہندوستان میں مسلمان کاریگر اور صناع اور دستکار پچھتر فی صدی سے کم نہ ہونگے۔ مگر سب جگہ ان کی حیثیت سرمایہ داروں کے غلاموں سے زیادہ نہیں جب تک ہاتھ پاؤں چلتے ہیں تب تک انھیں قوت لایموت ملتا ہے جب بیمار یا بوڑھے ہو جاتے ہیں تو خیرات پر زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوتے ہیں کیونکہ تندرستی کے زمانہ میں وہ روپیہ کچھ پس انداز کر کے کسی بنک میں رکھنا یا کسی کاروبار میں بعین منافع پر لگانا ناجائز سمجھتے رہے۔ مسلمانوں کی اس غیر متمدن زندگی کا نتیجہ یہ ہے کہ قوم کا بڑا حصہ مفلسی، کمزوری، اور بیماری سے فنا ہو رہا ہے اور جو باقی ہے وہ سرمایہ نہ ہونے سے بیجان ہے یہ سب اس وجہ سے ہے کہ عام طور پر مسلمان سمجھتے ہیں کہ ان کے لیے سود کی کوئی صورت بھی جائز نہیں ہے۔

بعض مسلمانوں کا یہ قول ہے کہ قرآن شریف کی آیۃ وَاَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا۔ کی رو سے سود کی حرمت قطعی ہے اور اس بارہ میں کسی تحقیق و تدقیق کی گنجائش نہیں ہے۔ یعنی یہ کہ جس طرح سے خداوند تعالیٰ نے ہر قسم کی بیع کو حلال کیا ہے ویسا ہی ہر قسم کے ربوا کو حرام کیا ہے مگر باوجود اس آیت کے حکم کے شراب اور سور کی خرید و فروخت مسلمانوں میں ناجائز قرار دی گئی ہے جس کے معنی ہیں کہ بعض قسم کی بیع اس آیۃ کے حکم سے مستثنے ہے پس کوئی وجہ نہیں کہ بعض قسم کا ربوا بھی اسی طرح اس آیۃ کے حکم سے مستثنے نہ ہو سکتا ہو۔ اگر مستثنے نہ ہو سکتا تو ایسے جلیل القدر علماء جیسے کہ شاہ عبد العزیز صاحب مرحوم نے بعض قسم کا ربوا جائز قرار دینے کی ہرگز جرأت نہ کرتے۔ بہر حال چونکہ سود کا مسئلہ مسلمانوں کے لیے اس قدر

اہم ہے کہ اس پر اس زمانہ میں اُن کی باعزت زندگی اور اُن کے قومی وجود کا انحصار ہے اس لیے اسے قوم کے سامنے پیش کیا جاتا ہے اور اوّل اس کی "دنیوی تاریخ" بیان کی جاتی ہے۔

سود کا براہ راست تعلق مال سے ہے اور مال کی قسمیں از روئے علم المعیشت کے زمین، محنت اور سرمایہ ہیں پس علی الترتیب ان تینوں اقسام کے اعتبار سے اس مسئلہ پر نظر کی جاتی ہے۔

باب اوّل

سود کی دنیوی تاریخ

فصل اوّل زمین

مختلف اقوام میں سود خوری کی ممانعت

دنیا کے ابتدائی دور میں صرف زمین انسانوں کی بسر اوقات کا ذریعہ تھی زمین سے جو پھل اور غلہ وغیرہ پیدا ہوتا تھا۔ یا مویشی جو چراگاہوں میں پرورش پاتے تھے وہی انسان کے مال و جائداد تھے۔ جب ان چیزوں کے باہمی تبادلہ میں دقت محسوس ہونے لگی تو سکہ کی ایجاد ہوئی۔ اس سادہ زندگی کے زمانہ میں جب کسی شخص کے پاس بسر اوقات کے لیے سامان کی قلت ہوتی تھی تو نیک دل اشخاص سے بغیر کسی معاوضہ کے اسے اُدھار مل سکتا تھا اور وہ بغیر کسی زیادتی یا معاوضہ کے واپس کر دیا جاتا تھا۔ البتہ جو لوگ ان طریقوں سے نفع اٹھانا چاہتے تھے وہ واپسی کے وقت مدیون سے زیادہ مقدار میں جنس یا سکہ لیتے تھے اور نہ صرف زیادہ طلب کرنے پر اکتفا کرتے تھے بلکہ ایک مدت معین میں اگر مال واپس نہ ہوتا تو دوگنے اور اس کے بعد چوگنے کا مطالبہ کرتے تھے۔ غریب اور مفلس اشخاص جب ان بار گراں کے متحمل نہ ہو سکتے تھے تو قرضہ کے عوض میں قرض خواہوں کی غلامی میں آنے پر مجبور ہوتے تھے اور اس حالت میں انواع و اقسام کی تکالیف برداشت کرتے تھے۔ بنی نوع انسان کے لیے غلامی کی یہ صورت مانع ترقی تھی اس لیے داد و ستد کا یہ طریقہ جو ربوا کے نام سے موسوم تھا قانوناً ممنوع اور روا جا معیوب

سمجھا جاتا تھا۔ اور اب تک سمجھا جاتا ہے۔ نہ صرف مختلف مذاہب کی کتابیں اس کی برائیوں سے مملو ہیں بلکہ زمانۂ حال کے تمدن اور معاشرت میں بھی اس کی مضرت ہر طبقہ میں مسلم ہے۔ تاریخ میں ہندوؤں کی تہذیب نہایت قدیم سمجھی گئی ہے ان کے یہاں صرف ویشیوں کو سود پر روپیہ دینے کی اجازت تھی اس شرط پر کہ وہ اپنے مال کے ایک چوتھائی حصہ سے زیادہ وادستد میں نہ لگا سکیں۔ نیز یہ کہ اصل سے زائد انھیں سود نہ دلایا جائے۔ چنانچہ اب تک اکثر ہندو ریاستوں میں یہ قانون از نام قانون دام دوپٹا یا (دھن دوپت) جاری ہے۔

مصریوں میں حضرت عیسیٰ سے آٹھ سو سال قبل قانون وضع ہوا تھا کہ وادستد کا معاہدہ تحریری ہونا چاہیے اور کسی صورت میں اصل سے سود نہ بڑھنے پائے۔

یونان کے مشہور مقنن لائی گرگس نے ۸۰۰ سال قبل حضرت عیسیٰ کے سود خوری کی ممانعت کر دی تھی تاہم وہ پھر جاری ہو گیا اور ۶۰۰ سال قبل حضرت عیسیٰ کے سود خواروں کے خلاف حکومت یونان بلوہ ہونے کے بعد ڈریکو نے سود کے خلاف سخت قانون پاس کیا جو خونی قانون کے نام سے مشہور ہو گیا اس کے تیس برس بعد سولن نے تمام مقروضوں کو جو قرضہ کی بدولت غلام ہو گئے تھے۔ آزاد کر دیا۔

ملک روم میں جو اب اٹلی کے نام سے موسوم ہے قانون کی رو سے شرح سود برابر گھٹائی جاتی رہی حتیٰ کہ سود کی بالکل ممانعت کر دی گئی۔ مگر جب سود کے بغیر کام نہ چل سکا تو کسٹم کے نام سے وہ پھر جاری ہو گیا اس کے بعد شرح سود وقتاً فوقتاً قانون کی رو سے مقرر ہوتی رہی حضرت عیسیٰ سے ۳۲۶ سال قبل روم میں یہ قانون جاری ہوا کہ قرضہ میں کوئی شخص اپنی ذات کو مکفول نہ کر سکے اس کی وجہ سے قرضہ کی غلامی منسوخ ہو گئی اس کے بعد بعض اور تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ مثلاً یہ کہ مختلف حیثیت کے لوگوں کے لیے مختلف شرح سود مقرر کی گئی۔ یا سود در سود کی ممانعت کر دی گئی۔

ارسطو کا قول

سود کے متعلق اس قسم کے احکامات کی وجہ یہ تھی کہ اس زمانہ میں بعض اشیاء کا استعمال نیک آدمیوں کے نزدیک صرف یہ تھا کہ وہ بیماری ضعیفی اور خشک سالی میں اپنے کام آوے یا کم مایہ لوگوں کو ضرورت کے وقت بطور قرض حسنہ کے دیا جاوے اور صرف اسی قدر تعلیم ہیں

واپس لے لیا جاوے نہ یہ کہ غربا کو قرض دیکر اُسے بڑھا یا جاوے کیونکہ اس سے غریب اور ضرورتمند آدمی تباہ ہو جاتے تھے۔ چونکہ اس طریقے کے سوا کوئی اور ذریعہ زرِ نقد سے نفع اُٹھانے کا نہ تھا۔ اس لیے ارسطو کا یہ قول کہ "زرِ نقد بچے نہیں دیتا" بلا وجہ نہ تھا۔ اُس زمانہ میں اور بہر مدتوں بعد تک پس انداز روپیہ گھروں کے اندر زمین میں دبایا جاتا تھا۔ یا مشہور امانت داروں کے پاس رکھدیا جاتا تھا۔ جو بلا معاوضہ اس کام کو کارِ خیر سمجھکر کرتے تھے۔

اشیاء کا کرایہ

زمانہ قدیم میں مثل زمانہ حال کے استعمالی اشیاء کو کرایہ پر دینے کا رواج تھا۔ مگر کرایہ لینا صرف اُن اشیا پر جائز تھا جو استعمال کے دوران میں قایم رہیں جیسے مکان، گھوڑا، سواری وغیرہ اور وہ چیزیں جو استعمال کے دوران میں صرف ہو جائیں اُنکا کرایہ لینا جائز نہ تھا جیسے غلہ، پھل وغیرہ۔ یہ چیزیں صرف بطور قرضِ حسنہ کے دینی جائز تھیں اور وزن یا تعداد کے اعتبار سے صرف مساوی مقدار میں واپس لی جاتی تھیں۔ روپیہ بھی چونکہ آخر الذکر قسم کی اشیا کے ذیل میں سمجھا جاتا تھا اور وہ محض ضروریاتِ زندگی فراہم کرنے کے لیے قرض لیا جاتا تھا۔ اس لیے اُس کا کرایہ لینا ناجائز تھا مگر باوجود مذہبی اور معاشرتی قوانین کی مخالفتوں کے روپیہ کے کرایہ یعنی سود کا رواج ہر زمانہ میں کسی نہ کسی صورت میں جاری رہا۔

سود جاری ہونے کی وجہ

وجہ یہ ہے کہ جب کوئی چیز کسی ضرورتمند کو عاریتاً دیجاتی ہے تو پوری مقدار میں وقتِ معہودہ پر اُس کا بلا استثنا واپس آجانا محالات سے ہے۔ چونکہ قرضہ حسنہ دینے والے کو اکثر صورتوں میں نقصان اُٹھانا پڑتا ہے۔ اس لیے یا تو وہ قرض دینے سے احتراز کرنے لگتا ہے یا گزشتہ اور آئندہ نقصانات کا تخمینہ کر کے کچھ رقم بطور تاوان یا نذرانہ کے مقروض سے واپسی رقم کے وقت لینی چاہتا ہے۔ ضرورتمند شخص چونکہ پریشان اور مضطر ہوتا ہے اس لیے اس قسم کے مطالبات کو منظور کر لیتا ہے مگر چونکہ یہ مطالبات شرعاً و قانوناً ممنوع ہوتے ہیں اس لیے ان کے جواز کی مختلف صورتیں پیدا کی جاتی ہیں مثلاً یہ کہ ازمنہ سابقہ میں جائداد مرہونہ کی آمدنی مرتہن کے لیے ناجائز سمجھی جاتی تھی۔ مگر اُس کے جواز کی یہ صورت نکالی گئی تھی کہ راہن جائداد

مرہونہ کی آمدنی مرتہن کو اُس مدت کے لیے ہبہ کر دے جب تک کہ زرِ رہن ادا ہو۔ اس قسم کے طریقوں کے رائج رہنے سے ہر ملک میں ایک جماعت ایسی ضرور رہتی تھی جو ضرورتمند لوگوں کی ضروریات روپیہ کا کرایہ لیکر پورا کرتی تھی اور بیش قرار معاوضہ ملنے کی اُمید پر دادوستد کا پیشہ اختیار کرتی تھی۔ یہ پیشہ اگرچہ حد درجہ معیوب تھا تاہم بغیر اس کے سوسائٹی کا کام چلنا دشوار تھا۔ چنانچہ عیسائیوں نے اپنے اقتدار کے زمانہ میں دادوستد کا کام یہودیوں کے سپرد کر دیا تھا۔ جو ہر طرح ذلیل و خوار سمجھے جاتے تھے۔

بڑی عزت حکومت میں تھی

دنیا کے اُس دور میں بڑی عزت اُس جماعت کی تھی جو جسمانی قوت کی بنا پر انسانوں پر حکومت کرتی تھی اور حکومت کے ذریعہ سے رعایا کی جان و مال کی مالک ہوتی تھی، رعایا میں امن قائم رکھتی تھی، اُس کی پاسبانی کرتی تھی، اور اُس کے معاوضہ میں رعایا کی آمدنی کا ایک حصہ لیکر اُسے اپنے کارکنوں میں تقسیم کرتی تھی۔ زمانہ مابعد تک مختلف ممالک کے انتظامات کا یہی طریقہ رہا جو اشخاص ان انتظامات میں شریک رہتے تھے وہ باعتبار پیشہ کے ملازمان سرکار، زمیندار اور تاجر، کہلاتے تھے اور یہ بھی پیشے معزز سمجھے جاتے تھے کیونکہ اُن کا تعلق کسی نہ کسی صورت میں حکمران جماعت سے ہوتا تھا۔ البتہ اسی زمانہ میں بعض لوگ انفرادی طور پر اپنے پس انداز روپیہ سے مال و اسباب کی تجارت کرتے تھے۔ ان لوگوں کو ضرورت کے وقت اگر کبھی کسی سے سودی قرضہ لینا پڑتا تھا تو پھر وہ دائن کے دام سے مدت العمر نہ نکل سکتے تھے اور دائن ان دکانداروں کی کمائی میں ہمیشہ کے لیے بڑے حصہ دار بن جاتے تھے۔ ان طریقوں سے مخلوق کو سودخوار دائنوں کے ہاتھوں سے نہایت نقصانات پہونچتے تھے اور اُن کا وجود قریباً تمام دنیا میں انسانی ترقی کا مانع سمجھا جاتا تھا۔

انگلستان میں سود کی ممانعت

چنانچہ انگلستان میں جب سود سے بہت تکلیف پہونچی تو سنہ ۱۵۴۶ء میں ازروے قانون کے انتہائی شرح سود دس فی صدی مقرر کر دی گئی اُس کے بعد یہودیوں کی سودخواری سے تنگ آکر ایڈورڈ ششم نے ۱۵۵۲ء میں ان الفاظ کے ساتھ سود لینے کی ممانعت کر دی کہ "سود سب سے زیادہ قابلِ نفرت اور قابلِ حقارت

گناہ ہے۔ اور خداوند تعالےٰ کے حکم کے خلاف ہے" مگر چونکہ دنیا کا کام بغیر سود کے نہیں چل سکتا۔ اس لیے پھر وہی قانون جاری کیا گیا جس کی رو سے انتہائی شرح سود دس فی صدی تک مقرر کی گئی تھی۔

فصل دوم

محنت

صنعت و حرفت انگلستان اور دیگر ممالک یورپ میں زراعتی پیداوار کم ہوتی تھی۔ نیز سخت سرد موسم سے بچنے کے لیے وہاں محفوظ مکانوں اور گرم کپڑوں کی ہر فرد کو ضرورت ہوتی تھی۔ برخلاف گرم ملکوں کے جہاں تھوڑی محنت سے غلہ وغیرہ آسانی سے پیدا ہو سکتا ہے۔ ان ممالک میں انسانوں کو لوہا اور دیگر معدنیات زمین سے کھود کر نکالنا، انھیں صاف کر کے ان سے مال تیار کرنا اور اُسے دوسرے ملکوں کو لیجانا پڑتا تھا تاکہ اُن کے بدلے میں خام جنس غیر ممالک سے منگا کر زندگی بسر کر سکیں اس کے لیے انہیں غیر معمولی محنت کرنی پڑتی تھی اور غیر معمولی محنت کی وجہ سے ملک میں دولت بڑھنے کی رفتار زیادہ تھی اور چونکہ وہاں اشیائے خوردنی کی قلت تھی اس لیے سامان خوردنی یا سکہ جن کے ذریعہ سے ضروری سامان خریدا جاتا تھا پس انداز کرنے کی زیادہ ضرورت تھی۔ یہ پس انداز یا فاضل روپیہ اول تو مکانات میں محفوظ رکھا جاتا تھا۔ مگر چونکہ ذاتی مکانوں میں حفاظت کا عمدہ سامان نہ ہوتا تھا اس لیے اُن ممالک کے لوگ اپنا اثاثہ سناروں کے پاس رکھوا دیتے تھے۔ سنار اس کے لیے اپنے مکانوں میں بڑے بڑے چوبچے بناتے تھے اور حفاظت کے لیے چوکیدار رکھتے تھے اور حفاظت کرنے کا کچھ کرایہ مالکان سرمایہ سے لیتے تھے۔ اُن ممالک میں کانوں اور کارخانوں میں کام کرنے سے معاش حاصل ہوتی تھی اور اُن میں انہماک رکھنے سے طرح طرح کے آلات اور مشینیں ایجاد ہونے لگیں اور اس طریقہ سے ایک جدید ذریعہ معاش محنت کے نام سے وجود میں آیا جس سے دنیا میں صنعت و حرفت کا دور شروع ہوا۔ جو کام پیشتر ہاتھوں سے مہینوں میں ہوتے تھے وہ مشینوں سے دنوں میں انجام پانے لگے۔ ہزاروں آدمیوں کی طاقت کے کام صرف چند آدمیوں کے ہاتھوں سے بذریعہ مشینوں کے ہونے لگے

بقول آدم سمتھ کے سابق میں ایک شخص دن بھر میں بمشکل تمام ایک پن بنا سکتا تھا مگر مشین کے ذریعہ سے ایک شخص ایک دن میں بیس ہزار پن بنانے لگا۔

فصل سوم

سرمایہ یا اصل

بنک کی ابتدا مندرجہ بالا طریقوں سے زمین اور انسانی محنت کے اتفاق عمل سے یا بالفاظ دیگر زمین کی موجودات پر صنعت و حرفت کے تصرف سے دنیا میں ایک تیسری چیز از نام سرمایہ پیدا ہوئی۔ جس کو زمین اور محنت کا بچہ کہا جاتا ہے۔ اس سے ملک میں دولت کی اس قدر افزایش ہوئی کہ سناروں کے گھروں میں امانت داروں کے سونے کے انبار بالکل بیکار پڑے رہتے تھے۔ اس حالت کو دیکھ کر اس کا ایک یہ مصرف نکالا گیا کہ مالکان کی اجازت سے سنار امانت کا روپیہ کارخانہ داروں وغیرہ کو تجارت کے لیے کرایہ یا سود پر دینے لگے اور جو سود وصول ہوتا تھا اُسکا ایک حصہ مالکوں کو دیتے تھے اور ایک حصہ خود رکھتے تھے۔

اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ اُس وقت تک روپیہ زیادہ تر غریب حاجتمندوں اور فضول خرچوں کو سود پر دیا جاتا تھا۔ ان لوگوں سے چونکہ روپیہ بمشکل وصول ہوتا تھا اور اکثر مارا بھی جاتا تھا اس لیے شرح سود گراں ہوتی تھی۔ ایسے لوگوں کو روپیہ دینے سے ملک کی دولت میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا تھا۔ مگر جب سناروں سے سوداگروں اور کارخانہ داروں نے روپیہ لیکر کاروبار میں لگایا اُس سے کارآمد اشیا پیدا کر کے خود روپیہ پیدا کیا اُس کا ایک حصہ سناروں کی وساطت سے مالکان مال تک جلد جلد بطور منافع کے پہونچایا تو اس نئے پورانے طریقوں کو بالکل بدل دیا اور اس سے لوگ اپنا بیکار دفینہ گھروں سے نکالکر سناروں کو سپرد کرنے لگے متوسط الحال اشخاص کفایت شعاری کی طرف

مائل ہوئے اور اپنا اپس انداز روپیہ ساہوکاروں کی وساطت سے ملک کی تجارت صنعت و حرفت میں لگا کر کسو بہ دولت میں حصہ دار بننے لگے۔ اس سے شرح سود اس قدر کم ہو گئی کہ تاجر اور کارخانہ دار سودی روپیہ سے خاطر خواہ نفع کما سکتے تھے۔ رفتہ رفتہ ان ساہوکاروں کی مشترک کمپنیاں بنیں جنہوں نے بالآخر بنکوں کی صورت اختیار کر لی اور اس طرح بنک، افراد قوم کا تھوڑا تھوڑا اپس انداز روپیہ اکٹھا کر کے ملک میں تجارت صنعت و حرفت پھیلانے اور ملک میں خوشحالی اور دولتمندی بڑھانے کا وسیلہ بن گئے۔

بنک کا اثر شرح سود پر

جو ساہوکار زراعت پیشہ افراد یا امیر فضول خرچوں یا غریب ضرورتمندوں کو روپیہ قرض دیتے ہیں ان کا روپیہ چونکہ مشکل سے وصول ہوتا ہے اس لیے ساہوکاروں کی نظر شروع ہی سے مقروضوں کی جائداد پر ہوتی ہے۔ اور وہ ہر صورت سے مدیون کو نچوڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر بنکوں کے ذریعہ سے چونکہ روپیہ ایسے ہاتھوں میں جاتا ہے جو ملک کی دولت میں افزایش کرتے ہیں اور لوگوں کی پیدا کی ہوئی دولت کا ایک حصہ بنکوں کے ذریعہ سے جلد جلد ان کے پاس پہنچتا رہتا ہے اس لیے بنکوں یا سرمایہ داروں کی نیت کسی کی جائداد حاصل کرنے کی نہیں ہوتی روپیہ قرض دینے والوں اور روپیہ سود پر لیکر کاروباری لوگوں کو دینے والوں (یعنی بنکوں) اور کاروبار کرنے والوں میں جب باہمی اعتماد بڑھا تو ملک کا سرمایہ بڑھنے کی کوئی حد نہیں رہی اور اس کے ساتھ شرح سود خود بخود گھٹتی گئی اور گورنمنٹ کا شرح سود کو قانون کی رو سے گھٹانا لوگوں کو ناگوار نہ ہوا۔ چنانچہ انگلستان میں گورنمنٹ نے ۱۶۲۴ء میں شرح سود دس فی صدی سے گھٹا کر آٹھ فی صدی کر دی تھی ۱۶۵۱ء میں اُسے چھ فی صدی کر دیا پھر پانچ فی صدی کیا اور انجام کار ۱۸۵۴ء میں تعین شرح سود کا قانون بالکل منسوخ کر دیا۔ یہ واقعہ سود کی تاریخ میں نہایت اہم ہے۔

قانون سود کی ترمیم کا مسودہ

انگلستان میں تعین شرح سود کا قانون منسوخ ہونے سے اگلے سال یعنی ۱۸۵۵ء میں ہندوستان میں بھی تعین شرح سود کی بندش گورنمنٹ کے حکم سے اٹھا دی گئی۔ اس سے وہ جائیں جو روپیہ کا لین دین کرتی تھیں زمین سے آسمان پر پہونچ گئیں اور جو اس سے محترز تھیں وہ آسمان سے زمین پر آ گریں۔ گورنمنٹ کے بعض نیک دل

عہدہ داروں نے رعایا کی یہ مصیبت دیکھ کر بعض اضلاع ہند میں مقامی قوانین پاس کرائے جن سے سود خواروں کے پنجوں سے قرضداروں کی رہائی ہو۔ مثلاً یہ کہ پنجاب میں قانون انتقال اراضی پاس ہوا اور بندیلکھنڈ اور اجمیر و بلوچستان وغیرہ میں مختلف اوقات میں شرح سود محدود کرنے کے قوانین نافذ کیے گئے مگر ہندوستان کے بڑے حصہ میں خاصکر مسلمانوں کی حالت قرضداری سے روز بروز زبوں ہوتی گئی۔ انھیں سود کے پنجہ سے رہا کرنے کے لیے آنریبل خواجہ غلام الثقلین صاحب مرحوم نے سنہ ۱۹۱۳ء میں شرح سود محدود کرنے کا مسئلہ صوبہ متحدہ کی کونسل میں پیش کیا اور بتایا کہ ہندوستان میں بالعموم روپیہ ایسے لوگوں کو قرض دیا جاتا ہے جو اُسے بار آور کاموں میں لگانا نہیں جانتے اس لیے انگلستان کا قانون یہاں کے حالات کے مطابق نہیں ہے اس میں ضروری ترمیم کی جائے۔ خواجہ صاحب مرحوم کی اس تجویز کو بعض حکام وقت نے بھی پسند کیا تھا مگر اُن کے انتقال سے یہ مسئلہ ناتمام رہ گیا۔

ربوا اور ربح میں فرق

مگر انگلستان میں شرح سود کی بندش دور ہو جانے سے سرمایہ زیادہ تر افزایش دولت کے کاموں میں لگایا جانے لگا اور غربا کی تباہی کا باعث نہ رہا۔ پہلے زمانہ میں بقول ارسطو کے "زر نقد بچے نہ دیتا تھا" مگر اب واقعی طور پر وہ اس کثرت سے بچے دے رہا ہے کہ اُن سے نہ صرف مغربی ممالک بلکہ دور دراز کے اُجڑے ہوئے مقامات آباد ہو رہے ہیں۔ انگلستان کی تاریخ سے واضح ہوتا ہے کہ سنہ ۱۵۴۵ء تک سود انسان کے لیے زہر ہلاہل تھا۔ مگر تین سو سال کے بعد انیسویں صدی میں وہ سب کے نزدیک امرت ہو گیا جس طرح کہ شراب کی قلب ماہیت ہونے سے اُس کا سُکر یا نشہ جاتا رہتا ہے جو اُس کے حرام ہونے کی علت ہے اور اس نئی صورت کا نام بدل کر سرکہ ہو جاتا ہے اسی طرح روپیہ کے کاروبار میں بکثرت لگنے سے ربوا کی قلب ماہیت ہو گئی اس کی مضرت منفعت سے بدل گئی اور اس کی جدید صورت کا نام انٹرسٹ یا ربح ہو گیا۔

سرمایہ خون حیات ہے

اس دور سے قبل دولت پیدا کرنے کے ذرائع زمین اور محنت تھے اور یہ دونوں محدود تھے۔ مگر جب سرمایہ (یا اصل) وجود میں آیا تو

اُس کی وسعت غیر محدود ہو گئی جو چیز پہلے غربا اور فضول خرچوں کو تباہ کرتی تھی وہ کاریگروں اور مزدوروں کی
پرورش اور ترقی کا ذریعہ بن گئی۔ جن لوگوں کو کھانے کو روٹی اور پہننے کو کپڑا اور رہنے کو مکان نصیب نہ
ہوتے تھے۔ وہ اس سرمایہ کی بدولت جو کارخانوں میں لگا اس قابل ہو گئے کہ اطمینان کی زندگی
بسر کر سکیں جن ممالک میں سرمایہ پیدا ہوا اور بڑھا اور وہاں اُس کے لیے میدان تنگ ہو گیا تو اُس نے
دیگر ممالک کا رخ کیا اور وہاں پہونچ کر پھلنا پھولنا شروع کیا یہاں تک کہ اُس کے ذریعہ سے سلطنتیں
قایم ہو گئیں ازمنہ سابقہ میں اولوالعزم قومیں ملکی فتوحات کی غرض سے اپنے وطن سے باہر نکلا کرتی تھیں
مگر اب وہ ایسی منڈیوں اور ایسے مقامات کی تلاش میں حیران و سرگردان پھرتی ہیں جہاں اُن کا
بنایا ہوا مال اچھے داموں فروخت ہو سکے اور جہاں اُن کے ملک کا فاضل سرمایہ مختلف کاموں میں
لگ کر مع اضافہ کے واپس آسکے۔ ان طریقوں سے دنیا میں سرمایہ کا دور دورہ ہوا۔ وہ ہر دو عاملان
پیدائش یعنی زمین اور محنت پر حکمراں ہوا۔ تہذیب جدید کا ایک لازمہ اور بنی نوع انسان کے جسم
کا خون حیات بلکہ روح حیات قرار دیا گیا (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو پروفیسر محمد الیاس صاحب برنی کی
کتاب علم المعیشت)

دولت اور اصل کا فرق

بعض اصحاب کے دل میں یہ خدشہ گزرا ہو گا کہ پہلے زمانہ میں ضرورتمند
قرضداروں سے جو روپیہ دائنوں کو سود در سود کی شکل میں بمقدار
کثیر وصول ہوتا تھا وہ بھی تو بعض افراد کی دولت بڑھاتا تھا۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ اُس صورت میں روپیہ
صرف غریب آدمیوں میں سے کھچکر امیروں میں جمع ہو جاتا تھا اور غربا کو تباہ و برباد کر دیتا تھا اور
اُس سے ملک کی دولت میں ذرہ بھر اضافہ نہ ہوتا تھا برخلاف اس کے اب نئی صورت یہ پیدا ہوئی
کہ امرا سے لیکر غربا تک کا روپیہ پس انداز ہو کر بنکوں میں اور کمپنیوں کے پاس جمع ہوا اُس کی مقدار
لاکھوں اور کروڑوں اربوں اور پدموں تک پہونچی۔ اُس سرمایہ سے جس کو اصل کہتے ہیں بڑے بڑے
کارخانے کھولے گئے، ریلیں نکالی گئیں، نہریں بنائی گئیں۔ نہروں کے ذریعہ سے کروڑوں کا مال
ایک جگہ سے دوسری جگہ آسانی سے منتقل ہونے لگا۔ انسانی آسایش کے ہزاروں کام کھل گئے

لاکھوں بیکار آدمی باکار ہو گئے اور جن لوگوں کا یہ روپیہ انسانی بھلائی کے کاموں میں لگا اُن کے پاس اُن کے روپیہ کا کرایہ یا منافع پانچ چھ اور آٹھ معین مقداروں میں پہونچنے لگا اور اس طریقہ سے پہونچنے لگا کہ اس کرایہ یا منافع دینے والے کو مطلق گراں نہ گزرے حتیٰ کہ داین کو مدیون نام تک کا بھی علم نہ ہو۔

زمانہ سابق میں تجارت اور ملکی بہبودی کے کاموں میں صرف وہ ہی شخص شریک ہو سکتا تھا جو خود تجارت کرتا یا کارخانہ چلاتا تھا مگر ان جدید طریقوں سے ہر پیشہ ور اور ہر باشندہ ملک اپنی کمائی میں سے کچھ نہ کچھ پس انداز کر کے بینکوں اور کمپنیوں کے ذریعہ سے ذاتی اور ملکی دولت کی افزایش میں حصہ لینے لگا۔

بینک ذریعہ تجارت

ان جدید ذرائع سے گھروں کا دبا ہوا روپیہ باہر نکل کر بینکوں میں آگیا خوش حال لوگ آرام کی نیند سونے لگے، ایک بیکار چیز جو اس کے مالک کے لیے خطرہ کا باعث بنتی تھی ملک کی دولت بڑھانے میں لگی پہلے زمانہ میں اُسے اپنے گھروں میں محفوظ رکھنے یا دوسروں کے پاس رکھانے میں کچھ نہ کچھ صرف کرنا پڑتا تھا اب اُسے بینکوں میں رکھا نے کا معاوضہ ملنے لگا کیونکہ وہاں وہ مزید دولت پیدا کرنے کا موجب ہو گیا۔ پہلے قرض ذلت و افلاس کا پیام سمجھا جاتا تھا۔ اب بینک جیسے ادارے قرض لیکر ایسی دولت پیدا کرتے ہیں۔ جو داین و مدیون دونوں کو مالامال کر دیتی ہے پہلے مال خریدنے کے لیے دور دراز مقامات کو روپیہ بھیجنا مشکل تھا۔ اب بینکوں کے ذریعہ سے کروڑوں روپے کی آمد و رفت صرف کاغذ کے پرچوں کے ذریعہ سے ہوتی ہے جنہیں اصطلاح میں چیک یا ڈرافٹ یا ہنڈوی کہتے ہیں ہر شخص میں استطاعت نہیں کہ دیگر ممالک سے ایک وقت میں لاکھوں کا سامان منگائے مگر بینکوں کے ذریعہ سے لاکھوں کا مال ایک وقت میں منگا کر بینک میں محفوظ رکھا جاتا ہے۔ مال منگانے والے کو جس قدر روپیہ میسر آجاتا ہے بقدر اُسی روپیہ کے وہ بینک سے مال لے آتا ہے۔ اور ہر بار رکے رکے ہوئے مال کا خرچہ ادا کرتا رہتا ہے۔ پہلے غربا کو تجارت کے لیے روپیہ میسر نہ آتا تھا اور اگر آتا تھا تو گراں سود کی وجہ

اُس سے کاروبار کرنے میں نفع نہ تھا۔ اب ادنی طبقہ کے لوگ صبح کو بینک سے خفیف کرایہ پر روپیہ قرض لے آتے ہیں۔ دن بھر اُس سے تجارت کرتے ہیں اور شام کو مع کرایہ کے واپس کر کے منافع سے اپنے بچوں کی پرورش کرتے ہیں۔ پہلے اشیاء تجارت خریدنے کے لیے روپیہ ڈھو کر بازاروں میں لیجانا پڑتا تھا۔ اب صرف ایک چیک کی کتاب جیب میں ڈالکر کروڑوں کا سامان خریدا جاسکتا ہے۔ بائع مشتری، دلال اور راشی سب کا حساب کسی نہ کسی بینک میں ہے کیونکہ گھروں میں روپیہ، اشرفی، نوٹ سب کا رکھنا دوبھر ہے۔ سب کے سب ایک دوسرے کو بینک کے نام چیک دیتے ہیں۔ بڑے شہروں میں متعدد بینک ہیں۔ ان سب کو ایک دوسرے کے چیکوں کا مقابلہ کرنے میں دقت ہوتی ہے اس لیے کل شہر کے بینکوں کا ایک حساب گھر ہوتا ہے۔ جہاں جملہ بینکوں کے نمائندے دن بھر میں ایک بار جمع ہوتے ہیں اور وہاں اپنے چیکوں کا تبادلہ کر کے اپنا اپنا حساب درست کر لیتے ہیں۔ بینکوں کے ذریعہ سے اس طریقہ پر کروڑوں اور اربوں کی تجارت کا بیوپار بغیر ایک پیسہ نقد کے لین دین کے بڑے شہروں میں ایک دن میں ہوجاتا ہے۔ کروڑوں روپیہ کی تجارت جب صرف پرچوں کے ذریعہ سے ہوسکتی ہے تو بینکوں کا بیشمار نقد روپیہ ملک کی تجارت اور صنعت میں لگ سکتا ہے اندازہ یہ ہے کہ جس قدر نقد روپیہ بینکوں میں جمع ہوتا ہے اُسی اعتبار کی وجہ سے اُس سے دس گونہ رقم کا لین دین ہوسکتا ہے۔

پس اس زمانہ میں بینک نہ صرف منتشر روپیہ کو ملک میں سے اکٹھا کر کے مزید دولت پیدا کرلیتے ہیں بلکہ وہ جمع شدہ روپیہ کی قوت کو دس گونہ بڑھا کر اُسے دنیا کے کاموں میں لگاتے ہیں اور خدا کی زمین کو گلزار بنانے کے باعث ہوتے ہیں۔ انسانی ترقی اور انسانی آسایش کی تمام چیزیں یعنی ریل، تار، برقی اور ہوائی جہاز، درسگاہیں، خیرات خانے، یتیم خانے، اسپتال، اسی طرح کے ظہور میں آئے۔ پہلے زمانہ میں اگر کسی کار خیر کے لیے کوئی رقم وقف کی جاتی تھی تو وہ چند روز میں صرف ہو کر ختم ہو جاتی تھی اگر اُس رقم کی جائداد خریدی جاتی تھی تو منتظموں کی اولاد اُس پر قابض ہو کر اسے اپنے تصرف میں لاتی تھی۔ اگر وہ امانتاً کسی سوداگر کے پاس رکھی جاتی تھی تو جب تک اس سوداگر کا کاروبار

چلتا تھا تب تک وہ امانت اُس تاجر کے کاروبار میں لگی رہتی تھی اور اگر سوءِ اتفاق سے سوداگر کا کام
بگڑ جاتا تھا تو اُس کے ساتھ وہ امانت بھی ڈوب جاتی تھی۔ مگر اب گورنمنٹ پرامیسری نوٹوں اور
بینکوں کی بدولت اس قسم کی امانتیں بے اندازہ وقت کے لیے محفوظ ہو جاتی ہیں۔ ایک طرف تو ان
سے ملک کی بہبودی کے کام جاری رہتے ہیں۔ دوسری طرف اُن [illegible] کا ایک مقصد اس کارِ خیر
کو ہمیشہ کے لیے قایم اور جاری رکھنا ہے۔

بیمہ

انھیں بینکوں کی بدولت انسانی حفاظت کی ایک اور صورت پیدا ہو گئی ہے وہ
یہ کہ متوسط الحال اشخاص اپنی آمدنی کا ایک حصہ بیمہ کرنے والی کمپنیوں کو دیتے
رہتے ہیں۔ یہ کمپنیاں اس روپیہ کو سرکاری نوٹوں یا مستند بینکوں میں جمع کر دیتی ہیں اور اس کے منافع
کے ایک حصہ سے بیمہ کرانے والوں میں سے جو لوگ قبل اختتام میعاد [illegible] فوت ہو جاتے ہیں،
اُن کے پس ماندگان کو موعودہ رقوم دیتی ہیں اور اس طریقہ سے نہ صرف ہزاروں بلکہ لاکھوں خاندانوں
کو تباہی اور بربادی سے بچاتی ہیں۔ بیمہ کرانے میں فریقین سے کسی کو کسی قسم کا نقصان نہیں ہوتا۔
یہ کمپنیاں صدہا سال سے قایم ہیں۔ اُن سے ہزاروں آدمیوں کو آخر عمر میں معقول رقمیں ملجاتی
ہیں۔ اور اگر وہ قبل از میعاد موعودہ مر جاتے ہیں تو اُن کے پسماندگان کو وصول ہو جاتی ہیں۔ اسیطرح
سمندر میں جہازوں کا بیمہ ہوتا ہے بڑی بڑی تجارت گاہوں میں آگ [illegible] ہزاروں لاکھوں
روپیہ کے جہاز ڈوب جانے پر اور بے شمار تجارتی سامان جلجانے پر مالکان جہاز و سامان اور مالکان بیمہ
کمپنی میں سے کوئی بھی برباد ہونے نہیں پاتا۔ دونوں فریق کے کاروبار نہ صرف بنے رہتے ہیں
بلکہ روزانہ ترقی کرتے جاتے ہیں۔ انسانی جان و مال کی ان سب صورتوں کا انحصار صرف اسی طریقہ
پر ہے کہ تھوڑا تھوڑا روپیہ بینکوں کے ذریعہ سے جمع ہو کر حقیقی دولت پیدا کرنے میں لگتا ہے اور اس کا
منافع سرمایہ دار، کارخانہ دار، بیمہ کرنے والے، بیمہ کرانے والے، سب میں حسب [illegible] تقسیم ہوتا ہے
اور ان طریقوں سے سوسائٹی کا انتظام بوجہ احسن قایم رہتا ہے۔ کیا ان میں سے کوئی صورت ایسی
ہے جو کسی حال میں کسی فریق کے نقصان یا اُن کی بربادی کی موجب ہوتی ہو؟ نہیں بلکہ [illegible] مالک

اور جن اقوام میں روپیہ جمع کرنے، پھیلانے، اور منافع تقسیم کرنے کے طریقے رائج نہیں ہیں وہ زیادہ تباہ اور برباد ہیں حتیٰ کہ اُن کا شمار متمدن اقوام اور متمدن ممالک میں نہیں رہا۔

باب دوم

سود کی مذہبی تاریخ

مذہب ہنود میں سود

باب اوّل میں مذکور ہوا ہے کہ ہندوؤں میں زمانہ قدیم میں صرف ویشوں کو اپنے مال کا چوتھائی حصہ سود پر چلانے کی اجازت تھی کیونکہ اُس زمانہ کے مقنن یہ سمجھتے تھے کہ دولتمند اشخاص کا کل روپیہ دادوستد میں لگ جانے سے ملک کی تجارت و کاشتکاری کو نقصان پہونچتا ہے اور روپیہ صرف ساہوکاروں کے پاس آکر جمع ہو جاتا ہے مگر خاص صورتوں میں ضرورت کے وقت علاوہ ویشوں کے دیگر اقوام کو بھی سود پر روپیہ دینے کی اجازت دیدی گئی تھی۔ اہل ہنود میں دھن (مال) دوپٹ کے قانون کا یہ منشا تھا کہ زیادہ سے زیادہ اصل کے برابر سود دلایا جاوے۔ اس سے زیادہ نہ دلایا جائے۔

منوجی اور تمام مذہبی مفسرین اس قانون پر زور دیتے رہے حتیٰ کہ زمانہ حال تک ریاستہائے راجپوتانہ و علاقجات بمبئی و سندھ و بعض دیگر ریاستہائے اہل ہنود و صوبہ اجمیر میں اس پر عملدرآمد ہے اور مارواڑ میں یہ مثل مشہور ہے کہ دونے سوا بیاج نہیں۔ مگر انگریزی علاقہ میں ۱۸۵۵ء میں جب شرح سود کی بندش اُٹھا دی گئی اور اُس کی وجہ سے دائنوں کو سود در سود کے ذریعہ سے ایک روپیہ کے بارے سیکڑوں روپے ملنے لگے تو ریاستوں کے رہنے والے مہاجن اپنے گھروں کو چھوڑ چھوڑ کر انگریزی عملداری میں آبسے اور روپے کی دادوستد سے مالامال ہو گئے (ملاحظہ ہو تاریخ قانون سود مصنفہ خواجہ غلام الثقلین صاحب)

مذہب یہود میں سود

یہودیوں میں حسب ذیل احکام کی رو سے سود لینے کی ممانعت تھی

(۱) "اگر تو میرے لوگوں میں سے جس کسی کو جو تیرے آگے محتاج ہے کچھ قرض دیوے تو اس سے بیاجیوں کی طرح سلوک مت کر اور اس سے سود مت لے" خروج باب ۲۲ آیت ۲۵

(۲) "اور اگر تمہارا بھائی تمہارے بیچ میں محتاج اور تہیدست ہو جائے تو تم اس کی دستگیری کرو خواہ وہ اجنبی ہو خواہ مسافر تاکہ وہ تیرے ساتھ زندگانی بسر کرے تو اس سے سود اور نفع مت لے اور اپنے خدا سے ڈر تاکہ تیرا بھائی تیرے ساتھ زندگانی بسر کرے تو اسے سود پر روپیہ قرض مت دے" احبار باب ۲۵ آیت ۳۵ و ۳۶ و ۳۷

مندرجہ بالا آیت میں اجنبی کو سود پر روپیہ دینے کی ممانعت ہے لیکن ذیل کی آیت میں اجنبیوں یا غیر یہودیوں سے سود لینا جائز قرار دیا گیا۔

(۳) "تو اپنے بھائی کو سود پر قرض مت دیجیو۔ نہ نقد کے سود پر نہ غلہ جات کے سود پر نہ کسی چیز کے جس کی بابت سود پر کی جائے تو اجنبی (نامختون) کو سودی قرض دیسکتا ہے۔ پر اپنے بھائی کو سودی قرض مت دیجیو" استثنا باب ۲۳ آیت ۱۹-۲۰۔ اس آیت کی رو سے یہودیوں نے دیگر اقوام سے سود لینا شروع کر دیا۔

مذہب عیسوی میں سود

عیسائیوں کے مذہب میں سود لینے کی کسی سے اجازت نہیں بلکہ قرض بلا سود دینے کی ہدایت ہے۔ چنانچہ لوقا کی انجیل ۶-۳۵ میں ہے

"اپنے دشمنوں سے محبت کرو اور احسان کرو اور قرض دو بجالیکہ اور کسی قسم کی زائد امید نہ رکھو بس تمہارا اجر بڑا ہوگا اور تم خدا کے بیٹے ہوگے" اس حکم کی تعمیل عیسائیوں میں پندرھویں صدی تک ہوئی چنانچہ ۱۴۴۲ء میں پادریوں نے ایک گشتی خط کے ذریعہ سے سود خواری کی مخالفت کی مگر چونکہ دنیا کا کاروبار بغیر سود کے چلنا دشوار تھا اس لیے بہت سے پادریوں نے سود خواری روکنے کے لیے مذہبی انجمنیں قائم کیں۔ یہ انجمنیں دیندار لوگوں سے چندہ اور خیرات لیکر غربا کو بلا سودی روپیہ دیتی تھیں مگر جب اس مد میں چندے ملنے بند ہو گئے تو پوپ نے اس امر کی اجازت دیدی کہ

قرضداروں سے اصل کے علاوہ کچھ رقم بقدر ضروری اخراجات کے وصول کر لی جایا کرے اس قسم کی انجمن تمام وینس میں ۱۴۶۲ء میں بسرپرستی پوپ پائیس دوم قایم ہوئی تھی جو رفتہ رفتہ تمام یورپ میں پھیل گئی۔ یہ انجمن مختلف شرح سود پر روپیہ دیتی تھی مگر کسی صورت میں نو فی صدی سالانہ یعنی بارہ آنے سیکڑہ ماہوار سے زیادہ سود نہیں لیتی تھی۔ بعض کیتھلک پادریوں کا یہ فتویٰ تھا کہ مذہب اوسط درجہ کے سود کی ممانعت نہیں کرتا۔ چنانچہ ۱۵۴۵ء میں جان مرٹن شہر کنٹربری کے بڑے لشپ نے یہ قانون پاس کر دیا کہ قرض دینے والوں کو دس فی صدی سے زیادہ سود نہ دلایا جاوے۔ اُس زمانہ کا تجربہ یہ تھا کہ تجارت میں بیس (۲۰) فی صدی منافع ہوتا ہے اس لیے روپیہ کے استعمال کا کرایہ اس سے نصف یعنی بقدر دس فی صدی کے قرار دیا گیا تھا۔ اس بنا پر پادری صاحب نے یہ فتویٰ دیا تھا کہ دس فی صدی تک روپیہ کا کرایہ انٹرسٹ یا بیاج ہے اور جائز ہے اس سے زیادہ یوزری یا ربوا ہے جو ناجائز ہے۔

باب سوم

مذہب اسلام میں سود

فصل اوّل۔ ربا النسیئة

ربا الجاہلیت قبل اس کے کہ سود کے بارہ میں احکام اسلام نقل کیے جائیں۔ یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ اسلام سے قبل عرب میں کس کس قسم کا سود رائج تھا۔

(۱) ابن جریر طبری کی تفسیر میں قتادہ سے روایت ہے: اِنَّ رِبَوا الْجَاهِلِيَّةِ اَنْ يَبِيعَ الرَّجُلُ الْبَيْعَ اِلٰى اَجَلٍ مُسَمًّى فَاِذَا حَلَّ الْاَجَلُ وَلَمْ يَكُنْ عِنْدَ صَاحِبِهِ قَضَاءٌ زَادَهُ وَاَخَّرَ عَنْهُ

ترجمہ اہل جاہلیت کا ربا یہ تھا کہ ایک شخص کوئی شے اُدھار فروخت کرتا ایک میعاد معین پر جب میعاد

گزر جاتی اور مدیون کے پاس سامان ادا نہ ہوتا تو دائن قرض بڑھا دیتا اور میعاد میں بھی زیادتی کر لیتا۔

(۲) امام فخر الدین رازی تفسیر کبیر میں تحریر فرماتے ہیں "ربا النسیہ وہ معاملہ ہے جو ایام جاہلیت سے مروّج تھا اور وہ یہ تھا کہ وہ لوگ اس عہد پر کچھ مال دیتے تھے کہ ہر ماہ مال کی ایک معین مقدار (بطور سود کے) وصول کرتے رہیں گے۔ اور اصل مال پورے کا پورا رہے گا پھر جب قرضہ کی میعاد آجاتی تو قرضدار سے اصل مال کا مطالبہ کرتے تو اگر وہ دینے سے معذور ہوتا تو قرض اور میعاد دونوں کو بڑھا دیتے

نوٹ :- یہ صورت موجودہ زمانہ کی دادستد سے بالکل مختلف ہے۔

(۳) ابن قیم اپنی کتاب اعلام الموقعین میں لکھتے ہیں کہ ظاہری ربا ربا النسیہ ہے جو ایام جاہلیت میں مروّج تھا۔ اور وہ یہ تھا کہ جب قرضدار ادائے قرض میں تاخیر کرتا تو قرضخواہ کے لیے مال بڑھا دیتا اور جوں جوں تاخیر کرتا اسی طرح مال بڑھتا جاتا یہاں تک کہ ایک سو کی رقم ہزاروں تک پہونچ جاتی اور غالباً اس معاملہ پر وہی لوگ مجبور ہوتے تھے جو نادار و محتاج ہوتے تھے۔ پس جب قرضخواہ مناسب دیکھتا تو اپنے مطالبہ میں تاخیر کرتا جس کے عوض قرضدار اس کو زیادتی ادا کرتا تاکہ مطالبہ اور حبس کی قید سے خلاصی پاتا رہے۔ یہ زیادتی وہ ایک وقت سے دوسرے وقت تک دیتا رہتا تھا جس سے اسکی مصیبت دوچند ہو جاتی تھی اور اس کا بال بال قرض سے بندھ جاتا یہاں تک کہ تمام کائنات قرض ہی میں فنا ہو جاتی۔

سود کی یہ صورتیں جو اس زمانہ میں رائج تھیں اُن کی مذمت اور ممانعت قرآن پاک کی حسب ذیل آیتوں میں کی گئی ہے۔

(۱) جس آیۃ میں کہ محض صدقہ کی خوبی اور ربوا کی خرابی بیان ہوئی ہے اور جس میں ربوا کے حرام ہونے کا کوئی حکم نہیں ہوا وہ آیۃ یہ ہے وَمَآ اٰتَیۡتُمۡ مِّنۡ رِّبًا لِّیَرۡبُوَا۟ فِیۡۤ اَمۡوَالِ النَّاسِ فَلَا یَرۡبُوۡا عِنۡدَ اللّٰہِ ۚ وَمَاۤ اٰتَیۡتُمۡ مِّنۡ زَکٰوۃٍ تُرِیۡدُوۡنَ وَجۡہَ اللّٰہِ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡمُضۡعِفُوۡنَ ۔

(رکوع ۴ سورہ روم پارہ ۲۱) ترجمہ :- اور جو تم سود دیتے ہو تاکہ لوگوں کے مال میں بڑھے پس وہ اللہ کے نزدیک نہیں بڑھتے اور جو دیتے ہو صدقہ جس سے تمہاری مراد خالص اللہ کی رضا ہوتی ہے پس یہ

صدقہ دینے والے لوگ مال کئی گنا کر لیتے ہیں"۔ اب ہم کلام مجید کی وہ آیات درج کرتے ہیں جن میں
ربوا کے متعلق احکام ہیں۔

(۳) اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ
الْمَسِّ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا فَمَنْ جَآءَهٗ
مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ وَاَمْرُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ وَمَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ
هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ (آخر سورہ بقرہ)

(آخر سورہ بقرہ) ترجمہ جو لوگ دنیا میں سود کھاتے ہیں وہ قیامت میں نہ اٹھ سکیں گے مگر ایسے
جیسے کوئی آسیب زدہ گرتا پڑتا اٹھتا ہو۔ یہ حالت اس وجہ سے ہو گی کہ وہ کہا کرتے تھے کہ بیع اور
ربوا ایک جیسے ہیں اور اللہ نے بیع کو حلال اور ربوا کو حرام کیا ہے سو جس کو اس کے رب کی
طرف سے فہمائش ہوئی اور ربوا سے باز آگیا اس کے لیے ہے جو کچھ کہ وہ اس سے پہلے لے چکا
اس کا معاملہ خدا کے حوالہ ہوا اور جو پھرے تو ایسے لوگ دوزخی ہیں وہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔

(۴) يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ ۝ (سورہ بقرہ)

ترجمہ: گھٹاتا ہے اللہ ربوا کو اور بڑھاتا ہے صدقات کو اور اللہ نا پسند کرتا ہے ہر ناشکر مجرم کو

(۴) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ فَاِنْ لَّمْ
تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُوْنَ
وَلَا تُظْلَمُوْنَ ۝ وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ؕ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ
تَعْلَمُوْنَ ۝ (سورہ بقرہ)

ترجمہ۔ اے مسلمانو! خدا کی (مواخذہ) سے اندیشہ کرو اور جو کچھ تمہارا سود کسی کے ذمہ رہ گیا
ہو اسے چھوڑ دو اگر تم حکم ماننے والے ہو۔ پس اگر تم نے نہ کیا تو ہوشیار ہو جاؤ اللہ اور رسول [illegible]
کے اگر تم نے معاملات سودی سے توبہ کر لی تو تمہارا حق صرف اصل مطالبہ ہے نہ تم [illegible] نقصان
اٹھاؤ اور اگر مدیون تنگدست ہے تو اس کو مہلت دینی چاہیے فراخی کے وقت تک اور بالکل معاف کر دو [illegible]

تو اور بھی بہتر ہے اگر تم کچھ سمجھ رکھتے ہو۔

(۵) یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْکُلُوا الرِّبٰوا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَۃً وَّاتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ

(سورہ آلِ عمران)

ترجمہ:۔ اے ایمان والو ربوا مت کھاؤ جو چند در چند گونہ ہوتا چلا جاتا ہے اور اللہ سے ڈرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔

مندرجہ بالا آیات سے واضح ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں وہی ربوا رائج تھا جس سے بنی نوع انسان کو نقصان پہونچتا تھا اور جس طرح دنیا کے تمام مذہبی اور معاشرتی قوانین ربوا کو انسان کی بربادی کا آلہ سمجھ کر اُسے ناجائز قرار دیتے رہے اسی طرح اسلام نے بھی اُسے ناجائز قرار دیا اور صاف الفاظ میں اس کی حرمت کی علت لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ بیان کر دی ہے کہ ربوا کا آئین دین یہ ہے کہ نہ کسی کو نقصان پہونچاؤ اور نہ خود نقصان اُٹھاؤ۔ یہ ربوا جو زمانہ جاہلیت میں رائج تھا ربا النسیہ کے نام سے موسوم تھا۔ اسی کی نسبت آنحضرت صلعم نے خطبۃ الوداع میں فرمایا تھا کہ ہر قسم کا ربوا جاہلیت کے ربوا سے نکلا ہے۔ اسی بنا پر حضرت ابن عباسؓ صرف ربا النسیہ کو حرام سمجھتے تھے۔ امام رازی کا قول ہے کہ قرآن شریف میں حَرَّمَ الرِّبٰوا کے حکم میں الربوا سے مراد وہ ربوا ہے جو ایام جاہلیت میں رائج تھا نیز شیخین نے اسامہ بن زید سے روایت کیا ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ لَا رِبٰوا اِلَّا فِی النَّسِیْئَۃِ کے سوا کوئی ربوا نہیں ہے۔ اس کو امام بخاری نے بھی نقل کیا ہے۔

معین منافع پر مضاربت کا جواز

جس قدر آیات اور احادیث مذکور ہوئیں ان سب کا اطلاق اس ربا پر ہوتا ہے جو ایام جاہلیت میں رائج تھا اور مخلوق کی تباہی کا باعث تھا۔ اُن کا اطلاق روپیہ کے اس کرایہ پر کسی طرح نہیں ہو سکتا جو تجارت اور کاروبار میں لیا اور دیا جاتا ہے۔ اس بارہ میں مصر کے ایک فاضل حضرت توفیق آفندی کی تقریر کے کچھ الفاظ بعینہٖ نقل کیے جاتے ہیں۔

"قرآن شریف کے اکثر مواضع میں ربا کا ذکر صدقات کے مقابلہ میں آیا ہے جیسا کہ فرمایا یَمْحَقُ اللّٰہُ

الَّذِينَ لُوا وَيُرْبِي الصَّدَقَاتِ اور فرمایا وَمَا آتَيْتُم مِّن رِّبًا لِّيَرْبُوَ فِي أَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوا عِندَ اللَّهِ ۖ وَمَا آتَيْتُم مِّن زَكَاةٍ تُرِيدُونَ وَجْهَ اللَّهِ الخ

اس کی وجہ یہی ہے کہ صدقہ تو غنی کی طرف سے ہوتا ہے جو وہ فقیر کو دیتا ہے۔ اور ربا فقیر کی طرف سے ہوتا ہے جو وہ غنی کو اس مخصوص حالت میں ادا کرتا ہے اور فِي أَمْوَالِ النَّاسِ کے لفظ سے یہ اعتراض نہیں ہو سکتا کہ فقرا کے پاس تو مال نہیں ہو سکتا کیونکہ فقیر اُس کو کہتے ہیں جس کے پاس ضروریات زندگی کا کچھ نہ کچھ سامان ہو چنانچہ علمائے لغت کہتے ہیں کہ فقیر وہ ہے جو مسکین سے کسی قدر خوشحال ہو اور مسکین وہ ہے جس کے پاس کچھ نہ ہو۔

تحریم ربا کے متعلق جو آیات قرآن مجید میں آئی ہیں ان کا سیاق بھی اسی بات کی تائید کرتا ہے کیونکہ قرآن میں جس جگہ فی سبیل اللہ خرچ کرنے اور نادار لوگوں کی امداد و اعانت کرنے کی ترغیب آئی ہے اس سے پہلے یا اس کے بعد متصل ہی یا اس کے ساتھ ہی تحریم ربا کا ذکر کیا گیا ہے جیسا کہ سورہ بقر سورہ آل عمران اور سورہ روم پڑھنے والوں پر ظاہر ہے۔ انھیں صورتوں میں تحریم ربا کا ذکر آیا ہے لیکن جو شخص نفع کمانے کے لیے کسی مالدار سے کچھ روپیہ اس وعدہ پر لے کہ اس کے نفع کا کچھ حصہ مالدار کو بھی دیتا جائیگا تو اس کو اہل عرب ربا نہیں کہتے بلکہ وہ مضاربت ہے اور فقہا جو یہ کہتے ہیں کہ مقدار ربح کا غیر معین ہونا واجب ہے تو اس کی کوئی دلیل و برہان نہیں ہے مضاربت کا مقدار منافع معین کرنے میں اور رہن کا منافع معین کرنے میں کیا فرق ہے۔ جو کسی شخص کو اس وعدہ پر کاشتکاری کے لیے دی جائے کہ وہ ہر سال صاحب زمین کو کچھ نقدی جس کی مقدار معین ہوگی دیتا رہے گا۔

پس ان دونوں صورتوں میں روپیہ یا زمین لینے والا شخص منافع کا ذمہ نہیں اُٹھا سکتا اور نہ اس کی مقدار یقینی طور پر سمجھ سکتا ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ زراعت کی صورت میں تو مقدار نفع کا معین کر لینا جائز قرار دیتے ہیں اور مضاربت کی صورت میں ناجائز حالانکہ ان دونوں صورتوں میں حقیقۃً کچھ فرق نہیں ہے اور یہ فرق جو بیان کیا جاتا ہے کہ مال مضاربت کو تحصیل نفع سے پہلے خرچ کر ڈالنا جائز ہے۔ بخلاف زمین کے جو زراعت کے لیے اجارہ پر لی جائے اس کو خرچ کر ڈالنا ممکن ہی نہیں۔ تو یہ ایک ایسا

اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ـ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ
عُدْوَانًا وَّظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِيْهِ نَارًا وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ـ اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ
مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيْمًا (سورہ نساء)

پہلی آیت میں اِلّا کا لفظ نہایت اہم ہے اور اس کی دو صورتیں ہیں یا تو اسے استثنا متصل مانا جائے
یا استثنا منقطع در صورت استثنا منقطع کے اس میں متعدد مختلف اور متفرق احکام ہیں جن کا
ایک دوسرے سے تعلق نہیں معلوم ہوتا۔ وہ یہ کہ آپس میں ایک دوسرے کا مال باطل طریقوں
سے مت کھاؤ بلکہ باہمی رضامندی سے تجارت کرو اور اپنے آپ کو ہلاک مت کرو۔ خداوند تعالیٰ
تم پر مہربان ہے اور جو سرکشی اور ظلم سے ایسا کرے گا (خواہ ایک دوسرے کا مال باطل طریقہ
سے کھائے گا یا ایک دوسرے کو قتل کرے گا) تو اس کو ہم قیامت کے دن دوزخ کی آگ
میں جھونک دیں گے اور یہ اللہ تعالیٰ پر آسان ہے۔ تم کو جن گناہوں سے منع کیا گیا ہے اگر تم ان میں
سے بڑے بڑے گناہوں سے بچتے رہو گے تو ہم تمہارے چھوٹے چھوٹے قصور محو کر دیں گے
اور تم کو لیجا کر مقام عزت میں جگہ دیں گے۔"

مندرجہ بالا مضمون کے پڑھنے سے معلوم ہوا ہوگا کہ اول باطل طریقوں سے مال کھانے کی
ممانعت ہے۔ اس کے بعد تجارت کرنے کی ہدایت ہے۔ پھر ایک دوسرے کو ہلاک کرنے یا اپنے نفسوں
کو ہلاک کرنے کی ممانعت ہے۔ اور ظاہر ہے کہ ان امور کو ایک دوسرے سے تعلق نہیں ہے۔

دوسری صورت وہ ہے جس میں اِلّا کو استثنا متصل مانا جاتا ہے۔ اس کے متعلق بجنسہ وہ عبارت
نقل کی جاتی ہے جو تفسیر کبیر میں درج ہے۔

"وَالثَّانِيْ اَنَّ مِنَ النَّاسِ مَنْ قَالَ اِلَّا مُسْتَثْنَاءٌ مُتَّصِلٌ وَاَضْمَرَ شَيْئًا فَقَالَ التَّقْدِيْرُ لَا تَاْكُلُوْٓا
اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَاِنْ تَرَاضَيْتُمْ كَالرِّبٰوا وَغَيْرِهٖ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ
مِّنْكُمْ"

اس قول کے مطابق تمام مندرجہ بالا آیات ایک دوسرے سے مربوط ہو کر مسلسل ہو جاتی ہیں اور

وہ سب مل کر ایک مضمون کی بابت حکم دیتی ہیں جیسا کہ حسب ذیل ترجموں سے واضح ہوگا:

"اے مسلمانو! اپنے مالوں کو آپس میں باطل طریقہ (یعنی ربا وغیرہ کے ذریعہ) سے مت کھاؤ اگرچہ تم اس پر باہم رضامند ہو۔ البتہ[1] باطل طریقہ (یعنی ربا وغیرہ کے ذریعہ) سے اپنے مالوں کو آپس میں کھانا تجارت کی صورت میں جائز ہے جو باہمی رضامندی سے ہو۔ اپنی جانوں کو ہلاکت میں نہ ڈالو (یعنی اپنے کو تنگی میں ڈالکر اپنے مال سے جائز حد تک فائدہ اٹھانے سے محروم نہ رہو) خداوند تعالیٰ تم پر مہربان ہے (یعنی سختی نہیں کرتا) اور جو ظلم اور سرکشی سے ایسا کرے گا (یعنی ایک دوسرے کا مال باطل طریقوں سے ظلم اور سرکشی کر کے کھائے گا) تو ہم اس کو دوزخ کی آگ میں جلائیں گے اور خدا پر یہ آسان ہے۔ اگر تم گناہ کبیرہ جن کے ارتکاب سے تمہیں منع کیا گیا ہے (یعنی ظلم اور سرکشی سے دوسروں کا مال باطل طریقوں سے کھانے سے) باز رہوگے تو ہم تمہاری چھوٹی چھوٹی برائیوں سے درگزر کریں گے اور تم کو اعلیٰ مقامات میں جگہ دیں گے۔"

آیۃ تجارۃ و سود کی تشریح

مندرجہ بالا آیات میں سے پہلی آیۃ کی ترکیب ایسی واقع ہوئی ہے کہ اس میں کوئی نہ کوئی لفظ مقدر ماننا پڑتا ہے۔ جو اصحاب اس میں اِلّا کو استثناء منقطع مانتے ہیں۔ وہ تکون کے بعد تجارۃً مقدر مانتے ہیں۔ مگر باوجود اس کے آیات میں ربط پیدا نہیں ہوتا۔

البتہ یہ ماننے سے کہ تکون کی ضمیر (واحد مونث) مضمون جملہ "لا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل" کی طرف راجع ہوتی ہے اور اس مضمون جملہ کو ھذہ یا الاکلۃ سے تعبیر کر کے اسے تکون کے بعد مقدر ماننے سے جملہ آیات میں ربط اور تسلسل پیدا ہو جاتا ہے اس صورت میں ترکیب کلام یہ ہوتی ہے

[1] یہ تفسیر کے مذکورہ بالا قول میں باطل سے مراد ربوا وغیرہ سے لی گئی ہے۔

[2] [illegible] ولا تقتلوا انفسکم کا اس کے بعض معنی حضرت عمرو بن العاص کی ایک روایت کے مطابق یہ ہیں کہ اپنی جانوں کو ہلاکت میں مت ڈالو یعنی یہ کہ جائز طریقوں کو چھوڑ کر تکلیف مالا یطاق مت اٹھاؤ۔ ان اللہ کان بکم رحیما یعنی کہ خدا تم پر [illegible] الزام [illegible] اور تخفیف [illegible] روا نہیں رکھتا۔ ۱۲

اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ هٰذِہٖ اِلَّا اَكْلَتُہٗ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ

اس قسم کی ضمیر راجع ہونے کی نظیر خود قرآن شریف میں موجود ہے۔ وہ یہ ہے:-

وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۚ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَكَ وَبَیْنَہٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّہٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ وَمَا یُلَقّٰىھَآ اِلَّا الَّذِیْنَ صَبَرُوْا ۚ وَمَا یُلَقّٰىھَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ (مَنْ اَظْلَمُ) آیت ۳۴ و ۳۵۔ رکوع ۵ حم سجدہ)

آیت ۳۵ میں وَمَا یُلَقّٰىھَا میں ھا کی ضمیر واحد مونث مضمون جملہ "اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ" کی طرف راجع ہوتی ہے خواہ اس مضمون جملہ کو "السَّجِیَّۃُ" سے تعبیر کیا جائے یا کسی اور لفظ سے۔ پس اس نظیر کے بعد اب اس بارہ میں کوئی شبہ باقی نہیں رہا کہ آیۃ مذکور میں اِلَّا استثناء متصل ہے اور تکون کی ضمیر مضمون جملہ مذکورہ بالا کی طرف راجع ہوتی ہے۔

آیات مندرجہ بالا میں دوسرے اہم الفاظ عَنْ تَرَاضٍ ہیں جن کے متعلق امام رازیؒ فرماتے ہیں وَالْمُرَادُ بِالتَّرَاضِیْ مُرَاضَاتُ الْمُتَبَایِعَیْنِ فِیْ مَا تَعَاقَدَا عَلَیْہِ فِیْ حَالِ الْمُبَایَعَةِ وَقْتَ الْاِیْجَابِ وَالْقَبُوْلِ یعنی باہمی رضامندی سے یہ مراد ہے کہ فریقین، بیع کا معاملہ کرتے وقت شرائط بیع طے کرکے اُن پر رضامند ہو جائیں۔ اب سوال یہ ہے کہ جبکہ مطلق تجارت حلال تھی تو اس جگہ تجارت کے ساتھ باہمی رضامندی کی شرط کیوں لگائی گئی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ آیت مذکور میں باطل طریقوں مثل جوا وغیرہ سے منع کیا گیا مگر تجارت کی صورت میں اُنھیں اس شرط پر جائز قرار دیا گیا کہ جملہ مراتب باہمی رضامندی سے طے کر لیے جائیں۔ مثلاً یہ کہ مال کی خرید کے وقت یہ طے کر لیا جائے کہ بائع کو فوراً اُس وقت قیمت دی جائے گی جبکہ وہ مشتری کو مال روانہ کر دے خواہ وہ کتنے ہی عرصہ میں مشتری کے پاس پہونچے۔ ظاہر ہے کہ مشتری، مال پانے کے بعد قیمت روانہ کرے گا مگر اُسے حسب قرارداد مال روانہ ہونے کے وقت سے مال پہونچنے کے وقت تک کا بیکار سود دینا ہوگا۔ آج کل بازاروں میں خریداری کے یہی طریقے ہیں اور بغیر اُن کو اختیار کیے کام نہیں چل سکتا۔ دیگر یہ کہ ہر شخص کے پاس اتنا کثیر روپیہ نہیں ہوتا کہ وہ زیادہ مال ایک دفعہ میں منگالے اس کے لیے بڑے شہروں میں منگایا ہوا مال کسی بنک

کی تحویل میں رہتا ہے۔ خریدار کو جس قدر روپیہ میسر آتا جاتا ہے وہ مال کی قیمت میں مع خفیف سود کے بنک کو ادا کر کے بقدر اُسی کے مال اٹھاتا رہتا ہے۔ یہ تمام طریقے اس زمانہ میں اس لیے رائج ہیں کہ آج کل روپیہ ایک منٹ کے لیے بیکار نہیں رہتا جس کے پاس جتنی دیر کے لیے روپیہ بیکار رہتا ہے اُتنا ہی وہ اُس سے فائدہ اُٹھا لیتا ہے۔ اور جس شخص سے جتنی دیر روپیہ جدا رہتا ہے اُتنا ہی اُسے نقصان رہتا ہے پس اس قسم کے تمام تجارتی طریقے قرآن پاک کی مندرجہ بالا آیات کی رو سے جائز قرار دیے گئے ہیں۔

دیگر آیات ربوا پر نظر اب ہم قرآن شریف کی جملہ آیات پر جو سود کے بارہ میں تین مختلف سورتوں میں بیان ہوئی ہیں یکجائی نظر کرتے ہیں۔

(۱) اخیر سورہ بقر میں جہاں اول صدقہ اور خیرات دینے والوں کی حالت کا بیان ہے اور ان کے ثواب اور اجر کا اور اُس کے مقابل سود خواروں کی حالت اور ان کی ذلت و خواری کا اُس کے بعد ربا جاہلیت کی حالت کا بیان ہے جو بار بار وصول کیا جاتا تھا اور پھر بھی اصل قرضہ مع سود چند در چند کے بذمہ مدیون باقی رہتا تھا۔ اُس کے بارہ میں حکم ہوا کہ ابتک جو کچھ دائنان وصول کر چکے ہیں اُس کا مواخذہ نہ ہوگا جس قدر باقی رہ گیا ہے وہ چھوڑ دیا جائے اور اصل کو جس کا چندگونہ وہ ربا کی صورت میں وصول کر چکے تھے معاف کر دیا جائے یا وصول کر لیا جائے اور اگر مدیون نادار ہے تو اس کو اصل کی ادائگی کے لیے اُس وقت تک مہلت دیجائے جب تک کہ وہ ادا کرنے کے قابل ہو۔

یہاں پر یہ امر قابل غور ہے کہ سورۂ بقر کی مذکورہ بالا آیات میں اُن لوگوں کو جو باقی ماندہ سود کا مطالبہ کریں خداوند تعالیٰ کی طرف سے اعلان جنگ دیا گیا ہے۔ حالانکہ کسی بدتر سے بدتر گناہ، یا بدکاری کے لیے خدا سے لڑائی لڑنے کی دھمکی نہیں دی گئی۔ یہ تو بدیہی بات ہے کہ جبکہ شرع میں زمین کا کرایہ لینا، مکانات کا کرایہ لینا، مویشیوں کا کرایہ لینا سب جائز ہیں تو یہ ہرگز قرین قیاس نہیں کہ روپیہ جس کے ذریعہ سے قرض گیرندہ تجارت وغیرہ کر کے کثیر دولت پیدا کر سکتا ہے اس کا کرایہ لینا کوئی ایسا سخت جرم ہو جو بمنزلہ خداوند تعالےٰ کے ساتھ لڑائی لڑنے کے سمجھا جائے پس ہو نہ ہو یہ خود ہماری سمجھ کا دھوکا ہے کہ ہم روپیہ کے ہر قسم کے کرایہ کو حرام سمجھے ہوئے ہیں حالانکہ مندرجہ بالا آیات پر

صاف طور پر ربوا کو صدقہ کے مقابلہ میں رکھا گیا ہے۔ چنانچہ صاف الفاظ میں ارشاد ہے یَمحقُ اللّٰہُ الرِّبٰو وَیُربِی الصَّدَقَات

ترجمہ:۔ گھٹاتا ہے اللہ ربوا کو اور بڑھاتا ہے صدقات کو۔

اس سے ظاہر ہے کہ اس زمانہ میں سخت دل لوگ غربا کو بجائے صدقہ وخیرات دینے کے نہایت گراں شرح سود پر قرض دیتے تھے ایسے ہی لوگوں کے لیے حکم ہوا کہ سود چھوڑ دو اور اگر نہیں چھوڑتے تو خدا اور اس کے رسول سے لڑنے کو تیار ہو جاؤ۔

(۲) قرآن شریف میں دوسرا موقع جہاں ربا کی نسبت ذکر ہوا ہے سورہ آل عمران ہے۔ جہاں ممانعت کے لیے جاہلیت کے ربا کی جو مخلوق کی تباہی کا باعث تھا قطعی ممانعت ہوئی۔ فقرہ ۲۰ میں ربا الجاہلیت یا ربا النسیئہ کی تعریفات بیان ہوئی ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے کہ دائن اپنے روپیہ کا سود وصول کرتا رہتا تھا اور جب میعاد پر روپیہ نہ ادا ہوتا تھا تو میعاد بڑھانے کے ساتھ مقدار قرض کو بھی بڑھا دیتا تھا جس سے مدیون کی مصیبت دوچند ہو جاتی تھی۔ اسی قسم کے قرض کے لیے ارشاد ہوا لَا تَاکُلُو الرِّبٰو اَضعَافًا مُضَاعَفَۃً یعنی وہ سود مت کھاؤ جو چند در چند ہوتا چلا جائے۔

نیز حضور سرورِ کائنات صلعم نے خطبۃ حجۃ الوداع میں صاف فرما دیا فَاِنَّ رِبٰو الجَاھِلِیَّۃِ مَوضُوعٌ گویا حضور کا یہ ارشاد آیات سورہ بقرہ وسورہ آل عمران کی ایک کھلی تفسیر ہے اور کسی دوسرے قسم کی سود کی حرمت اس سے ظاہر نہیں ہوتی۔

(۳) قرآن پاک میں تیسرا موقع جہاں سود کا ذکر ہوا سورہ نساء ہے جس میں تجارتی سود کے متعلق حکم ہے۔ اس سود کی نوعیت جاہلیت کے سود کی نوعیت سے بالکل مختلف ہے۔ دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ایک قومی تمدن کی بنیاد ڈالنے اور اس کو ترقی دینے والا ہے۔ دوسرا قومی تمدن کا قلع قمع کرنے والا اور قوم کو تباہ اور مسخ کرنے والا ہے۔ ان تینوں آیات کی باعتبار احکام کے قرآن پاک کی اس آیۃ میں مثال ملتی ہے۔

"مَرَجَ البَحرَینِ یَلتَقِیَانِ بَینَھُمَا بَرزَخٌ لَا یَبغِیَان" (سورہ رحمٰن) ترجمہ:۔ اسی نے

(کھاری اور میٹھے) دوست دربنا سکاے کہ آپس میں ملتے ہیں اور (پھر بھی) دونوں میں ایک پردہ رہتا ہے کہ (اس سے ایک دوسرے کی طرف بڑھ نہیں سکتے"

ربا رجاہلیت کو خداوند تعالیٰ نے حرام فرمایا یہ بنی نوع پر اس کا احسان تھا اور پھر مزید برآں یہ رحمت نازل کی کہ تجارتی سود کی اجازت حد اعتدال تک دیکر حدود رزق کو وسیع فرما دیا متقدمین اور متاخرین علما تفسیر کے بہت زمانہ بعد اس تجارتی سود کا دنیا میں ظہور ہوا ہے اس لیے الّا کا استثنا متصل ہونا ایک احتمال سمجھا گیا مگر حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی اس روایت نے کہ ھٰذہٖ الآیۃ مُحکَمۃٌ مَانُسِخَتْ وَلَا تُنْسَخُ اِلیٰ یَومِ القِیَامَہ

یعنی یہ آیت محکمات میں سے ہے نہ منسوخ ہوئی اور نہ قیامت تک منسوخ ہو گی" آیات زیر بحث کو آیات منسوخہ قرار دیے جانے سے بچا لیا حتیٰ کہ وہ زمانہ آگیا جبکہ تجارتی سود کا دور دورہ ہو گیا اور آیات بینات کی صداقت دنیا پر ظاہر ہو گئی۔

بینک وغیرہ سے استفادہ

اب سوال یہ ہے کہ تجارت میں سود کی صورتیں آیا صرف وہ ہیں جو محض تجارت پیشہ اشخاص کو فرداً فرداً پیش آتی ہیں یا اس میں وہ صورتیں بھی شامل ہیں جن پر قومی تجارت کا انحصار ہو مثلاً یہ کہ زندہ اقوام میں آج کل چند تجارت پیشہ اشخاص ہی تجارت میں شریک نہیں ہوتے بلکہ ان کی کل قوم کے افراد اپنی روزمرہ کی کمائی میں سے پیسہ پیسہ بچا کر اسے قومی بینکوں میں محفوظ کرتے ہیں یا مشترکہ کارخانوں کے سپرد کرتے ہیں یا اپنی گورنمنٹ کو قومی قرضہ کی شکل میں دیتے ہیں اور ان ذرائع سے روپیہ تمام ملک بلکہ دیگر ممالک میں پھیل کر اعلیٰ سے اعلیٰ سامان تیار کرتا ہے اور اس طرح قوم کا ہر فرد خواہ کوئی پیشہ کیوں نہ رکھتا ہو قوم کی تجارت میں شریک ہو کر نہ صرف ذاتی طور پر نفع اٹھاتا ہے بلکہ اپنی قوم کی قوت اور اس کے اقتدار کو بڑھاتا ہے اس کے علاوہ فقرہ نمبر ۱۴ سے واضح ہوا ہے کہ اس وقت کوئی کاروبار تجارت بڑے پیمانہ پر بغیر بینکوں کی وساطت کے نہیں ہو سکتا ہیں اس زمانہ میں بینک اور تجارت گویا مترادف الفاظ ہیں جن کے جائز ہونے میں ذرا بھی شک نہیں ہو سکتا اور کارخانوں اور بینکوں کی وساطت سے

جو روپیہ بطور منافع کے ملتا ہے وہ ربح ہے کیونکہ اس میں لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ کے حکم کی خلاف ورزی کسی صورت سے نہیں ہوتی۔

انفرادی داد وستد

بینکوں کے ذریعہ سے کاروبار اور تجارت کی تفصیل بیان ہو چکی مگر اب انفرادی کاروبار کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ زمانہ سابق میں تمام داد وستد کا کام بالکل ساہوکاروں کے ہاتھ میں تھا اور وہ زیادہ تر ضرورتمندوں یا غریب کاشتکاروں تک محدود تھا مگر بینکوں کے بکثرت قایم ہونے سے بینکوں کا براہ راست اثر انفرادی داد وستد پر پڑا ہے اور انفرادی داد وستد نے بھی بہت کچھ بینکوں کے طریقے اور وہی شرح سود اختیار کر لی ہے بلکہ بعض وقت یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ انفرادی داد وستد میں شرح سود اس قدر کم ہوتی ہے کہ بینکوں میں بھی نہیں ہوتی۔ یہ حالت محض بینکوں کے ساتھ مقابلہ کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ اکثر شہروں میں منڈیوں کے متعلق ایسے مہاجن ہوتے ہیں جو تجارت پیشہ اشخاص کو کاروبار کے لیے خفیف شرح سود پر روپیہ دیتے ہیں تجارت پیشہ اشخاص کو روپیہ قرض دینے سے مہاجنوں کا روپیہ مع منافع کے جلد جلد واپس آتا اور پھر سود یا منافع پر چلتا رہتا ہے۔ یہ لوگ در اصل سیکڑوں بیکار اور متوسط الحال اشخاص کو تجارت کراتے ہیں اور اپنے روپیہ کے عوض میں ان کے منافع کا ایک جزو لیتے ہیں۔ اس قسم کی داد وستد کی نسبت یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس سے کسی فریق پر ظلم ہوتا ہے اور لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ کی کسی طرح خلاف ورزی ہوتی ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اس سے بہت سے بیکار اشخاص باکار ہو سکتے اور اطمینان کی زندگی بسر کرنے لگتے ہیں۔

فصل دوم

ربوا الفضل

تعریف ربا الفضل میں اختلافات

پہلی فصل میں ربا النسیہ کی تفصیل بیان کی گئی جس کو

ربا جلی اور ربا حقیقی بھی کہتے ہیں۔ آنحضرت صلعم کے ارشاد "لا ربوا الا فی النسیئہ" کے رو سے بجز ربا النسیہ کے کوئی ربا نہیں ہے۔ چنانچہ حضرت فاضل شیخ اسمٰعیل خلیل مصری نے اپنی ایک تقریر میں ارشاد فرمایا ہے کہ "عرب جب اپنے محاورہ میں ربا کا لفظ بولتے تھے تو اس سے ان کی اسلامی اصطلاح میں ہمیشہ ربا النسیہ مراد ہوتا تھا" اب رہی ربا کی دوسری قسم جو ربا فضل کے نام سے موسوم ہے وہ فی الواقع بیع کی ایک صورت ہے جس میں کچھ بڑھوتری لی اور دی جاتی ہے۔ واضح ہو کہ ربا نسیہ میں بڑھوتری مدت کے مقابلہ میں ہوتی ہے اور ربا فضل میں بڑھوتری فی الحال اور دست بدست ہوتی ہے۔ ربا فضل کی حرمت آنحضرت صلعم کے اس قول پر مبنی ہے۔ عَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلعم اَلذَّھَبُ بِالذَّھَبِ وَالْفِضَّةُ بِالْفِضَّةِ وَالْبُرُّ بِالْبُرِّ وَالشَّعِیْرُ بِالشَّعِیْرِ وَالتَّمْرُ بِالتَّمْرِ وَالْمِلْحُ بِالْمِلْحِ مِثْلًا بِمِثْلٍ سَوَاءً بِسَوَاءٍ یَدًا بِیَدٍ وَاِذَا اخْتَلَفَتْ ھٰذِہِ الْاَصْنَافُ فَبِیْعُوْا کَیْفَ شِئْتُمْ اِذَا کَانَ یَدًا بِیَدٍ۔

ترجمہ: سونا بدلے سونے کے اور چاندی بدلے چاندی کے اور گیہوں بدلے گیہوں کے اور جَو بدلے جَو کے اور کھجور بدلے کھجور کے اور نمک بدلے نمک کے برابر سرابر دست بدست بیچا کرو اور اگر یہ اقسام مختلف النوع ہوں تو جس طرح چاہو بیچو بشرطیکہ دست بدست بیع ہو" مگر اس مسئلہ میں کہ کن کن ہم جنس چیزوں کے مبادلہ میں بڑھوتری لینا جائز ہے ائمہ مجتہدین میں اختلاف ہے۔ امام ابو حنیفہ رحؒ کے نزدیک اس ہم جنس مال کے مبادلہ میں بڑھوتری ناجائز ہے جو پیمانہ سے نپتا یا وزن سے تلتا ہو۔ امام شافعی رحؒ کے نزدیک وہ مال جو بدلا جائے یا تو قیمتی ہو جیسے چاندی سونا یا وہ شئی خوردنی ہو۔ امام مالکؒ کے نزدیک وہ مال چاندی سونا ہو یا ایسا ہو جو انسان کی اصلاح کرتا ہو جیسے نمک وغیرہ۔ ان اختلافات کا نتیجہ یہ ہے کہ امام شافعیؒ کے نزدیک چاندی سونے کے سوا باقی ایسی چیزوں کے مبادلہ کی بڑھوتری پر جو مشتمل ہے

اور چونہ وغیرہ کے کھانے میں نہیں آتیں، ربا کا حکم نہیں ہے اور امام ابو حنیفہ کے نزدیک ربا کا حکم ہے
اسی طرح قلیل مقدار غلہ اور پھلوں وغیرہ کے مبادلہ کے متعلق اماموں میں بہت اختلافات ہیں جن کی
تفصیل میں طوالت ہوگی۔

ان کے علاوہ خود مضمون حدیث مذکور میں بھی اختلافات ہیں چنانچہ ابن قیم نے اعلام الموقعین
میں لکھا ہے کہ جائز ہے کہ ربا الفضل کی ممانعت کراہت کی وجہ سے ہو نہ کہ حرمت کی وجہ سے۔ احمد اور
ابو داؤد سے روایت ہے کہ نبی صلعم نے ایک اونٹ، دو اور تین اونٹوں کے عوض خرید کیا
اچھا اونٹ زکوٰۃ کے اونٹوں سے ادا کر دے اسی سلسلہ میں عالیجناب شیخ عبد العزیز جاویش
مصری کی ایک تقریر کا اقتباس ذیل میں نقل کیا جاتا ہے۔

"نیل الاوطار کی پانچویں جلد کے صفحہ ۹۹، ۱۰۰ میں اس بارہ میں ایک حدیث بیان
کر کے یہ بھی لکھا ہے کہ اس میں اس امر کا جواز ہے کہ جنس قرض سے اچھی جنس ادا کیجائے جب کہ
عقد میں اس کی شرط نہ کی گئی ہو۔ اور اسی کو جمہور نے اختیار کیا ہے۔ اور مالکیوں کے نزدیک اگر
عدد میں زیادتی ہو تو جائز نہیں اگر وصف میں زیادتی ہو جائز ہے مگر جابر کی حدیث مذکورہ اس
مذہب کے معارض ہے جس میں اس امر کی صراحت ہے کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے عدد میں
زیادتی کی ہے۔ پھر آگے چل کر کہتا ہے کہ اگر مقداروں میں زیادتی ادا کے وقت کی جائے جسکی
نہ شرط کی گئی ہو نہ نیت ہو۔ پس ابی ہریرہ اور ابو رافع اور عرباض اور جابر کی حدیث کی رو
سے ظاہر ہے کہ یہ بلا فرق زیادتی وصف و مقدار و قلیل و کثیر کے جائز ہے بلکہ مستحب ہے۔ چنانچہ
محلی وغیرہ شافعیہ کہتے ہیں کہ قرضدار کے لیے مستحب یہ ہے کہ خاص کردہ جنس کی نسبت اچھی
جنس ادا کرے کیونکہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ ان خیر کم احسنکم قضاءً اب میں کہتا ہوں
کہ ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آدمی کو چاہیئے کہ قرض جب ادا کرے تو کسی قسم کی زیادتی
کے ساتھ ادا کرے چنانچہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس کو مستحسن قرار دیا ہے اور اس کی رغبت
دلائی ہے بلکہ خود اس پر عمل کیا ہے ان لوگوں کی بات میری سمجھ میں نہیں آتی جو کہتے ہیں کہ اگر

عقد میں کسی قسم کی زیادتی کی شرط کی جائے یا نیت رکھی جائے تو وہ زیادتی جائز نہ ہوگی اس کی دلیل کیا ہے احادیث تو نہ کسی قید سے تعرض کرتی ہیں نہ شرط سے بلکہ کوئی کہنے والا کہہ سکتا ہے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو مستحسن قرار دیا ہے اور اس کی ترغیب دی ہے تو یہ کیوں جائز نہیں کہ کوئی شخص اس کو اپنے لیے لازم بنالے اور خود قرض دار نفس عقد میں اس کو اپنے لیے شرط کرلے جبکہ یہ اس پاک پیغمبر کا فعل ہے جس کو لوگ خیر الناس کہتے ہیں۔ ہاں فقہا کہہ سکتے ہیں کہ زیادتی کا مشروط ہونا ربا کا باعث ہوگا۔ اور ربا جائز نہیں اور یہ بالطبع ان کے قائم کردہ اصول کے مطابق ہے اسی قبیل سے یہ ہے کہ امام مالک سے مروی ہے کہ میں یہ بالکل درست سمجھتا ہوں کہ کوئی شخص ایک سو درہم قرض لے اور ادا کے وقت ایک سو بیس دے اگر یہ زیادتی اسی مجلس میں دی جائے جس میں قرض دیا گیا ہے جبکہ وہ معتاد ہو نہ معہود۔"

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر تھوڑی سی پہلے سے طے نہ ہو جائے تو وہ ربا کے حکم میں نہیں آتی اور نہ صرف یہ بلکہ وہ جائز اور مستحسن ہے۔

ربا الفضل کی حرمت کی وجہ

واقعہ یہ ہے کہ ربا الفضل دراصل اس زمانہ میں رائج تھا جبکہ سکہ کا رواج بہت کم تھا اور خرید و فروخت اجناس کے باہمی تبادلہ کے ذریعہ سے جس کو انگریزی میں بارٹر کہتے ہیں عمل میں آتی تھی۔ اس امر کی تفصیل کے لیے عالیجناب شیخ عبدالعزیز جاویش مصری کی تقریر کا ایک حصہ ذیل میں نقل کیا جاتا ہے:۔

"اس وقت گو عرب میں دراہم و دنانیر مروج تھے مگر وہ نہ مسکوک و مضروب تھے نہ حجم و وزن کے لحاظ سے کوئی ان کا معیار مقرر تھا یہ دنانیر و دراہم ان کے پاس بلاد فارس و روم سے آتے۔ ان میں سے کوئی ہلکا ہوتا کوئی وزن دار۔ اسی طرح انہیں سونے چاندی کی ملاوٹ میں کبھی بڑا تفاوت ہوتا تھا۔ ہاں مع ذالک کچھ سونے چاندی کے ٹکڑے اور ریزے بھی مروج تھے جن کے ساتھ وہ باہم تبادلہ اشیا کرتے تھے۔ ہر ایک ٹکڑہ وزن قیمت میں خواہ کسی قدر ہوتا اُسے دینار کہتے

چاندی کا ہوتا تو درہم۔

جناب نبی علیہ السلام نے دیکھا کہ نقود کا مسئلہ جہالت میں گھر رہا ہے اور عام اہل عرب نہ ان نقود کی مقدار سے واقف ہیں نہ ان کے معیار اور قیمتوں کے فرق کو سمجھتے ہیں اور اسی طرح وہ ان نقود کی مقررہ قیمت سے بھی واقف نہیں کیونکہ وہ ان کے بنائے ہوئے نہیں اور اس لیے کہ انھوں نے یہ نقود ان کی مقررہ قیمت کے ساتھ ان ممالک سے حاصل نہیں کیے جہاں وہ بنتے ہیں بلکہ عرب کے سوداگروں کے ذریعے سے ان تک پہونچے ہیں۔ ان تمام امور کو دیکھکر جناب رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارادہ فرمایا کہ سونے اور چاندی کے مقابل میں خاص حدود مقرر کیجائیں جن سے ضرر رساں ربا اور غلط حسابی اٹھ جائے اور دھوکا دینے والوں کا سادہ لوح اور کم فہم لوگوں پر داؤ نہ چل سکے۔"

ہنڈوی کی نسبت شاہ عبدالعزیز صاحب کا فتویٰ

مندرجہ بالا تقریر سے واضح ہوتا ہے کہ کم فہم لوگوں کو دھوکہ سے بچانے کے لیے آنحضرت صلعم نے فرمایا تھا کہ ہم جنس اشیاء کا مساوی وزن سے تبادلہ کیا کرو۔ البتہ اگر مختلف الحیثیت اشیاء کا جو ہم جنس ہوں تبادلہ ناگزیر ہو تو ان کی قیمت قرار دے کر انھیں بدل لیا کرو۔ چنانچہ جب ایک بار آنحضرت صلعم کو معلوم ہوا کہ کسی شخص نے دو صاع خرما دیکر ایک صاع عمدہ خرما خریدے تھے تو آپ نے اس کو منع فرمایا اور ارشاد فرمایا "بِعِ الْجَمْعَ بِالدَّرَاهِمِ ثُمَّ ابْتَعْ بِالدَّرَاهِمِ جَنِيبًا" یعنی خراب خرما کو دراہم کے عوض میں فروخت کر کے پھر ان درہموں سے بہتر خرما خرید لیا کرو۔"

یہ طریقہ آنحضرت صلعم نے اس زمانہ میں بتایا تھا جبکہ بارٹر یعنی اجناس کے مبادلہ کا رواج تھا مگر موجودہ زمانہ میں معین وزن اور معین قیمت کے سکہ کا رواج نہایت کثرت سے ہو گیا ہے اور اجناس کا مبادلہ مفقود ہو گیا اس لیے ربا الفضل جو فی الواقع ایک قسم کی بیع فاسد ہے اس کا وجود بھی اب نہیں رہا البتہ بعض صورتیں ایسی ہیں جنھیں فقہا نے اس زمانہ میں ربا الفضل قرار دیا ہے مگر اسی کے ساتھ ان کے جواز کی صورتیں بھی تجویز کر دی ہیں مثلاً۔

Nizamuddin Khan M.B.B.S.

(۱) ہنڈوی کے ذریعہ سے روپیہ بھیجنا جو ایک قسم کا منی آرڈر ہی اور اس میں ایک مقام سے دوسرے مقام کو روپیہ منتقل کرنے کا کرایہ دیا اور لیا جاتا ہی اور اُس میں بازار کے بھاؤ کے مطابق کمی بیشی ہوتی رہتی ہی اور اُسے فقہانے ربا قرار دے کر ناجائز کیا ہی مگر حضرت شاہ عبد العزیز صاحب محدث دہلوی نے مندرجہ ذیل تحریر میں اُس کے جواز کی ایک صورت قرار دی ہی۔

"دو کتب فقہ میں لکھا ہی کہ ہنڈوی کرانا مکروہ ہی اور ہنڈوی کو سُفتجہ اور سفاتج کہتے ہیں چنانچہ شرح وقایہ میں لکھا ہی۔

وَيُكْرَهُ السُّفْتَجَةُ وَهِيَ اِقْرَاضٌ لِسُقُوطِ خَطَرِ الطَّرِيْقِ فِي المُغْرِبِ السُّفْتَجَةُ بضم السين وفتح التاء ان يدفع مالا بطريق الاقراض ليدفع الى صديقه في بلد آخر وانما يقرضه لسقوط خطر الطريق. یعنی مکروہ ہی سفتجہ یعنی ہنڈوی اور ہنڈوی سے مراد یہ ہی کہ مال کسی کو بطور قرض کے دیا جاوے اس غرض سے کہ وہ مال اُس شخص کے ذریعہ سے کسی ایسے شخص کے پاس پہونچ جاوے جس کے پاس وہ مال بھیجنا منظور ہو اور راہ میں وہ مال نقصان نہ ہووے مغرب میں لکھا ہی کہ سفتجہ ساتھ ضمہ سین اور فتحہ تا کے یہ ہی کہ کسی شخص کا دوست دوسرے شہر میں ہووے اور اُس شخص کو منظور ہو کہ کوئی مال اُس دوست کے پاس بھیجے تو اس احتیاط کے خیال سے کہ وہ مال راہ میں نقصان نہ ہو جاوے وہ مال کسی دوسرے شخص کو بطور قرض کے دیوے تا وہ دوسرا شخص اس امر کا ذمہ دار ہو جاوے کہ وہ مال اُس دوست کے پاس باحتیاط پہونچا دیگا اور راہ میں وہ مال نقصان نہ ہوگا اور یہ معاملہ اس غرض سے ہوتا ہی کہ راہ میں اس مال کے نقصان ہو جانیکا خطرہ باقی نہ رہے اب ہم یہ امر بیان کرتے ہیں کہ ایسا معاملہ ہنڈوی کا یہاں تین طور پر ہوتا ہی کہ جو ساہوکار اس شرط پر روپیہ لیتے ہیں کہ کسی دوسرے خاص شخص کے پاس باحتیاط وہ روپیہ پہونچا دیویں وہ ساہوکار کبھی ایسا کرتے ہیں کہ جس قدر روپیہ لیتے ہیں صرف اسی قدر روپیہ ہنڈوی کے کاغذ میں لکھ دیتے ہیں نہ زیادہ لکھتے ہیں نہ کم لکھتے ہیں یعنی اُس سے اُن ساہوکاروں کا مطلب یہ ہوتا ہی کہ جس قدر روپیہ ہم نے لیا ہی اُسی قدر کل روپیہ اُس شخص کے پاس پہونچا دیں گے جس کے

پاس منظور ہی کہ روپیہ پہونچ جاوے اور ہم یہ روپیہ پہونچانے کے عوض میں کچھ بطور اجرت کے
نہ لینگے اور اس غرض سے کہ یہ روپیہ جبتک ہمارے پاس رہیگا ہم کو اُس سے فائدہ ہوگا ہم اس
کے عوض میں کچھ دیں گے بھی نہیں اور ساہوکار کبھی ایسا بھی کرتے ہیں کہ جس قدر روپیہ
لیتے ہیں اُس سے زیادہ لکھدیتے ہیں یعنی ان لوگوں کا مطلب یہ ہوتا ہی کہ جبتک یہ روپیہ ہمارے
پاس رہیگا اس سے ہم کو فائدہ ہوتا رہیگا تو اس کے عوض میں اس قدر روپیہ زیادہ اس شخص
کے پاس پہونچا دیں گے جس شخص کے پاس وہ روپیہ پہونچ جانا منظور ہی اور کبھی ساہوکار ایسا بھی کرتے
ہیں کہ روپیہ زیادہ لیتے ہیں اور ہنڈوی کے کاغذ میں اس سے کم لکھتے ہیں یعنی ساہوکار کا
مطلب یہ ہوتا ہی کہ جس قدر روپیہ ہم نے لیا ہی اس میں سے اس قدر روپیہ پہونچانے کے عوض میں
بطور اجرت کے ہم لینگے اور باقی اس قدر روپیہ اس شخص کے پاس پہونچا دیں گے جس کے پاس منظور ہی
کہ یہ روپیہ پہونچ جاوے پہلی صورت میں یعنی ہنڈوی میں جب روپیہ پورا لکھ دیا جاوے تو اس
صورت میں سود ہونے کا شبہ نہیں اور باقی دونوں صورت میں صراحۃً سود ہی۔ دوسری صورت
میں یعنی جب ہنڈوی کے کاغذ میں روپیہ بڑھا کر لکھدیا جاوے قباحت یہ ہی کہ ہنڈوی کرانے
والا سود لیتا ہی اور تیسری صورت میں یعنی جب ہنڈوی کے کاغذ میں روپیہ کم کرکے لکھا جاوے یہ حرج
ہی کہ ہنڈوی کرانے والا سود دیتا ہی (اما طریق حلال کردن این ربا بسیار آسان ست) لیکن اس
سود کو حلال کرنے کا ایک نہایت آسان طریقہ ہی۔ مثلاً اگر منظور ہو کہ ۱۰۰ روپیہ کی ہنڈوی کرائی جاوے
اور شرط قرار پاوے کہ ہنڈوی کے عوض میں ساہوکار کو دس روپیہ دیا جاوے تو چاہیے کہ اٹھانوے
روپیہ ساہوکار کو دیا جاوے اور بارہ روپیہ کا پیسہ ساہوکار کے ہاتھ فروخت کیا جاوے اس شرط پر کہ
اس بارہ روپیہ کے پیسے کی قیمت ساہوکار سے صرف دو روپیہ لیجاوے گی تو اب ساہوکار کے ذمے
ہنڈوی کرنے والے کا سو روپیہ بطور قرض کے ہوگیا۔ اب اس ساہوکار سے کہہ دیا جاوے کہ ۱۰۰ روپیہ
فلاں شخص کے پاس فلاں مقام میں تم پہونچا دو تو ایسی حالت میں یہ بھی ہوا کہ ساہوکار کو ۱۰ روپیہ ہنڈوی
کے عوض میں دیا گیا اور اس میں کوئی قباحت بھی نہیں ہوئی یعنی غیر جنس ہونے کے سبب سے

سود دینا لازم نہ آیا اور یہ حدیث صحیح مشکوٰۃ شریف میں موجود ہے کہ ایک شخص خیبر سے آیا اور وہ خرما لے آیا وہ خرما نہایت خوب اور نفیس تھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا خیبر میں سب خرما ایسا ہی ہوتا ہے تو اس شخص نے عرض کیا کہ لَا یَا رَسُولَ اللّٰہِ اِنَّا لَنَاْخُذُ الصَّاعَ بِالصَّاعَیْنِ یعنی نہیں یا رسول اللہ سب خرما اسی طرح کا نہیں ہوتا بلکہ وہاں دوسرے طرح کا کچھ خرما ہوتا ہے وہ خرما [illegible] صاع دیتے ہیں اور اس کے عوض میں عمدہ خرما ایک صاع خریدتے ہیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا فَاِنَّ الرِّبٰوا لَا تَفْعَلْ ھٰذَا اَلْبَتَّہَ یعنی سود ہے کسی چیز کو اس کے ہم جنس سے زیادہ یا کم خریدنا ایسا کام نہ کیا کرو بَلْ بِعِ الْجَمْعَ بِالدَّرَاھِمِ ثُمَّ ابْتَعْ بِالدَّرَاھِمِ جَنِیْبًا یعنی بلکہ ایسا کیا کرو کہ خراب خرما کو دراہم کے عوض میں فروخت کیا کرو اور پھر ان دراہم سے بہتر خرما خرید لیا کرو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب معاملہ خرید و فروخت میں غیر جنس کا واسطہ ہو جاوے تو زیادہ لینے یا دینے میں سود لازم نہیں آتا یعنی مثلاً کوئی چیز دو سیر اس کے غیر جنس کے عوض میں فروخت کی جاوے اور پھر وہ چیز غیر جنس دے کر وہی سابق چیز ایک سیر خرید لی جاوے تو اس میں سود کا معاملہ لازم نہیں آتا۔ اور اگر یہ معاملہ ہو کہ مثلاً ساہوکار کو سو روپے دیا جاوے کہ وہ ساہوکار سو روپے اس شخص کے پاس پہونچا دیوے جس کے پاس روپیہ بھیجنا منظور ہے اور یہ شرط قرار پاوے کہ ساہوکار سو روپے میں سے روپیہ دینے والے کو کچھ واپس دے دے گا اور اس کو بھرت کہتے ہیں اور ساہوکار سو روپے پورا اس شخص کے پاس پہونچا دے گا جس کے پاس وہ روپیہ پہونچانے کی شرط ہے یعنی ایسا معاملہ اس صورت میں ہوتا ہے جب ساہوکار کو روپیہ لینے کی غرض ہوتی ہے مثلاً ساہوکار کی غرض ہو کہ جب تک روپیہ اس کے پاس رہیگا اس روپے سے ساہوکار کو فائدہ ہوتا رہیگا تو اس صورت میں لازم آتا ہے کہ ہنڈوی کر لینے والا سود لیتا ہے تو اس معاملہ کے جواز کی ترکیب یہ ہے کہ مثلاً اگر منظور ہو کہ سو روپے کی ہنڈوی کرائی جاوے اور شرط قرار پاوے کہ اس میں سے ساہوکار پانچ روپیہ واپس دیدے گا اور ایسے معاملہ میں جو روپیہ واپس ہوتا ہے۔ اس کو بھرت کہتے ہیں تو اس معاملہ کے جواز کی صورت یہ ہے کہ سو روپے میں دس روپے ہنڈوی کر لینے والا

اپنے پاس رکھ لیوے اور باقی نوے روپیہ ساہوکار کو دیوے اور اس دس روپے میں سے پانچ روپیہ کا پیسہ تڑا دے اور وہ پیسہ بھی ساہوکار کو دیوے اور باقی پانچ روپے خود لے لیوے اور ساہوکار پورا سو روپیہ اس شخص کے پاس پہونچا دیوے جس کے پاس وہ پہونچانے کی شرط ہو تو اس معاملہ میں ایسا ہوا کہ گویا پانچ روپیہ کا پیسہ دیا گیا اور اس کے عوض میں دس روپیہ لیا گیا اور خلاف جنس ہونے سے اس معاملہ میں کچھ قباحت نہیں مثلاً عام طور پر ایک روپیہ کا سولہ گنڈا پیسہ ملتا ہے اور بوقت ضرورت آٹھ گنڈہ پیسہ ایک روپیہ دے کر لے لیا جاوے تو یہ سود نہیں اس واسطے کہ سود یہ ہے کہ کوئی چیز دی جاوے اور اس کے عوض دوسری چیز اسی کی ہم جنس کم یا زیادہ لی جاوے اور باقی اور شرطیں بھی سود کی پائی جاویں تو ایسے معاملہ میں سود ہوتا ہے اور جب کوئی چیز دی جاوے اور اس کی غیر جنس چیزوں میں کوئی دوسری چیز کم یا زیادہ لی جاوے تو یہ سود نہیں۔

مندرجہ بالا تحریر سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ (۱) ہم جنس اشیاء کا غیر مساوی مبادلہ بھی سود کے حکم میں ہے اور وہ حرام ہے۔ (۲) مگر سود کوئی ایسی حرام چیز نہیں ہے جس کے حلال ہونے کی کوئی صورت نہ ہو چنانچہ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اما طریق حلال کردن این ربا بسیار آسان است۔ یعنی اس سود کا حلال کرنا نہایت آسان ہے (۳) اور وہ طریقہ یہ ہے کہ جو روپیہ دوسرے مقام پر بھیجنے کے لیے ساہوکار کو دیا جاوے اس میں کچھ پیسے شامل کر دئے جائیں تاکہ بدلین غیر جنس ہو جائیں۔

چاندی وغیرہ کی خرید و فروخت کا جواز

(۴) ربا لفضل کی دوسری صورت اس زمانہ میں چاندی وغیرہ کی خرید و فروخت ہے۔ الذہب بالذہب والی حدیث متذکرہ صدر کی رو سے چاندی کے روپے سے چاندی خریدی جاوے تو وہ روپیہ کے وزن کے مساوی ہو یعنی چاہیے نہ کم نہ زیادہ۔ مگر بازار میں چاندی کا نرخ کبھی روپے کے وزن سے کم اور کبھی زیادہ ہوتا ہے۔ مثلاً کسی زمانہ میں چاندی کا بھاؤ دس آنے تولہ تھا اور اب سوا روپیہ تولہ ہے پس بازار کے بھاؤ سے چاندی کا روپیہ کے وزن سے کم و بیش خریدنا ربا لفضل کے حکم میں سمجھا جاتا ہے چنانچہ جو مسلمان متقی اور محتاط ہیں وہ وہی طریقہ اختیار کرتے ہیں جو حضرت شاہ

عبدالعزیز صاحبؒ نے تحریر فرمایا ہے یعنی وہ چاندی کے روپیہ کے ساتھ کچھ تانبے کے پیسے شامل کر دیتے ہیں تاکہ چاندی کے ساتھ نا برابر جانے سے بدلین غیر جنس ہو جائیں، نہ حدیث پاک کی خلاف ورزی ہوا اور نہ خریدار کو نقصان رہے۔ ربا فضل سے بچنے کا یہ طریقہ متفق علیہ ہے۔

جس زمانہ میں سکہ کے ٹکڑے مساوی نہ ہوتے تھے تب نا واقف لوگوں کو دھوکہ سے بچانے کے لیے یہ حکم کہ ہم جنس اشیا مساوی الوزن فروخت کی جائیں مفید اور ضروری تھا مگر اس زمانہ میں سکہ کی ایک معین قیمت ہوتی ہے خواہ وہ خالص چاندی کا ہو یا مخلوط دھاتوں کا ہو یا محض کاغذ کا ہو۔ ان حالات میں وہ کسی طرح کسی دھات کا ہم جنس نہیں سمجھا جا سکتا اور کوئی صورت ایسی معلوم نہیں ہوتی کہ اس کے ذریعہ سے خریداری کرنے میں ربا فضل کے گناہ کے ارتکاب کا احتمال ہو سکتا ہے۔ تاہم اگر کسی کے نزدیک اس کا احتمال ہوتا ہو تو وہ فقہا کے مذکورہ بالا طریقہ کے مطابق سکے کے ساتھ کوئی غیر جنس شی ملا کر شریعت کی ظاہری اور باطنی دونوں قسم کی خلاف ورزی سے بچ سکتا ہے۔ اگرچہ نتیجہ کے اعتبار سے ان طریقوں کا اختیار کرنا اور نہ کرنا مساوی ہے۔ چنانچہ جس زمانہ میں چاندی سستی تھی تو متقی اور غیر متقی سب ہی دس آنہ میں ایک تولہ چاندی خریدتے تھے اور اب جبکہ چاندی گراں ہے تو سب ہی سوا روپیہ میں ایک تولہ چاندی خریدتے ہیں خواہ بائع کو چاندی کے بدلے میں روپیہ دیں یا نوٹ دیں یا روپے اور پیسے ملا کر دیں۔

بہرحال فقہا نے نہ صرف ربا فضل سے بچنے کے طریقے بتا دیے ہیں بلکہ مسلمانوں کی سہولت کے لیے میعادی ربا یعنی ربا نسیہ سے بچنے کے طریقے بھی بتا دیے ہیں۔ اگر تفصیل معلوم کرنی ہو تو جناب مولوی احمد رضا خاں صاحب بریلوی کا رسالہ کفل الفقیہ الفاہم فی احکام قرطاس الدراھم کے صفحات ۳۷ تا ۷۷ ملاحظہ فرمائیں۔

فصل سوم

ربوا فی دار الحرب

ربا کی تنہا ناجائز صورت

اس باب کی پہلی فصل میں ربا النسیہ کے بیان میں دکھایا گیا تھا کہ تجارتی اغراض سے سود کا لین دین کرنا جو بنی نوع انسان کی بہبودی کا باعث ہو اسلام میں جائز ہی۔ دوسری فصل میں ربا الفضل کی تفصیل بیان کرنے کے ساتھ یہ عرض کیا گیا تھا کہ اب اُس کا وجود دنیا میں نہایت کم ہو اور اگر ہو تو اُس کے جواز کی صورتیں علمائے کرام نے بتا دی ہیں۔ ان کے بعد صرف وہ سود باقی رہجاتا ہی جو اگرچہ بعینہ ربا النسیہ یا ربا جاہلیت تو نہیں ہی مگر ایک حد تک باعتبار نتیجہ اور اثر کے ربا جاہلیت سے مشابہ ہی۔ جیسا کہ اوپر مذکور ہوا ربا جاہلیت کی خصوصیت یہ تھی کہ قرضہ دینے کے وقت جملہ شرائط قرض طی نہ ہوتے تھے۔ مدیون مدت محدود تک معینہ ماہوار سود ادا کرتا رہتا تھا۔ اور جب مدت گزر جاتی تو دائن اُس سے اصل کا مطالبہ کرتا تھا۔ اگر وہ مدیون کو دستیاب نہ ہوتا تو دائن اصل قرضہ کو دوگنا یا کئی گونا کر دیتا جو سراسر ظلم تھا۔ اس طریقہ سے سود کے دو حصے تھے ایک معمولی ماہواری سود جو اگر خفیف ہو تو امام مالک کے نزدیک جائز تھا۔ دوسرا وہ تاوانی سود جو ایک مدت کے بعد دوگنا یا جتنا دائن چاہتا کر دیا جاتا۔ ظاہر ہی کہ اب اس سود کا وجود مشکل سے کہیں ہوگا۔ آج کل جو طریقہ رائج ہی اُس میں شرح سود اور سود در سود پہلے سے طی ہو جاتی ہی اور ضرورت کی وجہ سے لاکھوں غریب اور نادار اشخاص نہایت گراں شرح مثلاً ایک آنہ اور دو آنہ فی روپیہ ماہوار پر قرضہ لیتے ہیں۔ عام طور پر یہ سود اگر ادا نہ ہو تو چھ ماہ کے بعد اصل میں شامل کر دیا جاتا ہی اور بعض صورتوں میں سہ ماہی بلکہ ماہوار ادا نہ ہونے پر سود در سود کے حساب سے واجب الادا ہوتا ہی۔ یہ سب صورتیں غریب آدمیوں کو ہلاک کر دینے والی ہیں اور بالخصوص مسلمانوں کی

قوم اسی کا شکار بن رہی ہے۔ اس قسم کا سود جس طرح کہ تمام مذاہب میں ممنوع ہے۔ اسی طرح اسلام میں بھی ناجائز اور حرام ہے۔ مگر اسلام نے اس میں ایک استثنار کیا ہے۔ جس کی بنا ایک حدیث مرسل پر ہے جو آنحضرت صلعم کے ایک ثقہ تابعی حضرت مکحول رح سے مروی ہے۔ وہ حدیث یہ ہے:-

لَا رِبٰو بَیْنَ الْمُسْلِمِ وَالْحَرْبِیِّ فِیْ دَارِ الْحَرْبِ۔ یعنی دارالحرب میں مسلم اور غیر مسلم کے درمیان سود کا لین دین ربوا کے حکم میں نہیں آتا۔ اسی حدیث کی بنا پر حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی یہ رائے تھی کہ غیر اقوام سے دارالحرب میں سود لینا منع نہیں ہے۔ البتہ دارالاسلام میں غیر اقوام سے بھی سود نہ لیا جائے۔

دارالحرب کی تعریف

اس حدیث پر بحث کرنے سے قبل لفظ دارالحرب کی تنقیح کی ضرورت ہے۔ حرب کے لفظ سے بالعموم یہ سمجھا جاتا ہے کہ دارالحرب وہ مقام ہے جہاں مسلمانوں کو امن حاصل نہ ہو اور اُسے چھوڑ کر چلا جانا اُن پر فرض ہو حالانکہ دارالحرب محض دارالاسلام کے مقابلہ میں استعمال ہوتا رہا ہے جیسا کہ حسب ذیل تعریف سے جو فقہ کی کتاب کافی میں درج ہے واضح ہوگا۔

اَنَّ مُرَادَ بِدَارِ الْاِسْلَامِ بِلَادٌ یُجْرٰی فِیْهَا حُکْمُ اِمَامِ الْمُسْلِمِیْنَ وَیَکُوْنُ تَحْتَ قَهْرِهٖ وَبِدَارِ الْحَرْبِ بِلَادٌ یُجْرٰی فِیْهَا اَمْرُ عَظِیْمِهَا وَیَکُوْنُ تَحْتَ قَهْرِهٖ۔

یعنی دارالاسلام سے وہ شہر مراد ہیں جن میں مسلمان حاکم شریعت جاری کریں اور وہ شہر مسلمان حاکم کی حکومت میں ہوں اور دارالحرب سے وہ شہر مراد ہیں جن میں اُن کے بڑے کا حکم جاری ہو اور ان کے (غیر مسلم) کے تسلط میں ہوں۔

دارالحرب کی اسی قسم کی تعریفات فتاوی قاضی خان۔ فتاوی سراجیہ خزانۃ المفتین وغیرہ میں کی گئی ہیں جن میں سے صاحب درمختار کی بیان کی ہوئی تعریف یہ ہے:-

لَا تَصِیْرُ دَارُ الْاِسْلَامِ دَارَ الْحَرْبِ اِلَّا بِاُمُوْرٍ ثَلٰثَةٍ بِاِجْرَاءِ اَحْکَامِ اَهْلِ الشِّرْکِ وَبِاتِّصَالِهَا بِدَارِ الْحَرْبِ وَبِاَنْ لَّا یَبْقٰی فِیْهَا مُسْلِمٌ اَوْ ذِمِّیٌّ اٰمِنًا بِالْاَمَانِ الْاَوَّلِ

عَلیٰ نَفْسِہٖ وَدَارُ الْحَرْبِ تَصِیْرُ دَارُ الْاِسْلَامِ بِاِجْرَاءِ اَحْکَامِ اَھْلِ الْاِسْلَامِ فِیْھَا"

ترجمہ:۔ دار الاسلام تین طرح دار الحرب بن جاتا ہے۔ اول یہ کہ دار الاسلام میں مشرکوں کے احکام جاری ہو جائیں۔ دوسرے یہ کہ اس کا الحاق یا اتصال کسی دار الحرب سے ہو جائے تیسرے یہ کہ مسلمان بادشاہ کے وقتیں جن شرائط پر وہاں مسلمان اور ذمی رہتے تھے وہ شرائط وضوابط بدل جائیں"

یہ تینوں صورتیں کم وبیش ہندوستان میں موجود ہیں مگر امام محمد اور امام ابو یوسف رح کے نزدیک صرف ایک شرط سے دار الحرب ہو جاتا ہے کہ وہاں غیر مسلموں کے قوانین جاری ہو جائیں تمام تعریفات سے یہ صریح نتیجہ نکلتا ہے کہ جہاں مسلمانوں کی حکومت ہو اور ان کے احکام جاری ہوں وہ دار الاسلام ہے اور اس کے علاوہ جتنے ملک ہوں وہ دار الحرب ہیں خواہ وہاں مسلمانوں کو مذہبی آزادی حاصل ہو یا نہ ہو۔ پھر دار الحرب کی دو قسمیں ہیں۔ ایک دار الامن جہاں اگرچہ مسلمان بادشاہ نہ ہو اور اسلامی قوانین جاری نہ ہوں مگر مسلمان مذہبی عبادات میں آزادی رکھتے ہوں جیسا کہ آج کل ہندوستان ہے۔ دوسری قسم دار الفرار ہے جس میں مسلمانوں کو مذہبی آزادی حاصل نہ ہو یہی وہ مقامات ہیں جہاں سے مسلمانوں کو ہجرت کرنا ضروری ہے۔

ایک زمانہ میں خود مکہ معظمہ میں احکام اسلام جاری نہ تھے اور وہاں غیر مسلموں کی حکومت تھی اور اس لیے وہ دار الحرب تھا۔ تاہم رسول اللہ صلعم نے غیر مسلموں کے ساتھ صلح کی اور معاہدہ پر دستخط کیے جس سے مسلمانوں کو مکہ معظمہ میں آنے جانے اور قیام کرنے کی آزادی حاصل ہوئی اس وقت تک اگرچہ مکہ معظمہ احکام اسلام جاری نہ ہونے کی وجہ سے دار الحرب تھا تاہم آنحضرت صلعم نے وہاں غیر مسلموں سے اس وقت تک لڑائی نہیں کی جب تک کہ خود غیر مسلموں نے عہد شکنی نہ کی۔ پس ان دنوں مکہ معظمہ دار الامن تھا جو دار الحرب کی ایک قسم ہے۔ اور فریقین ہی حالت امن و امان کی تھی۔

بعض مسلمان ہندوستان کو دار الحرب کہتے ہوئے ڈرتے ہیں کہ مبادا یہاں سے ہجرت کرنا فرض نہ ہو جائے۔ ایسے اصحاب حضرت شاہ عبد العزیز صاحب کا یہ فتوےٰ ملاحظہ فرمائیں "مراد از دار حرب کہ ازاں ہجرت فرض باشد آں دار حرب است کہ حربیان از اظہار دین چوں صوم و صلوٰۃ جمعہ و جماعات و اذان و ختان سکان آنجا را ممانعت نمایند و اگر چنیں نباشد بلکہ مسلمانان آنجا اظہار دین خود بے دغدغہ مے کنند و جمعہ جماعات را قایم مے دارند و بیان احکام دین خود بے تکلف مے کنند پس ازاں دار حرب ہجرت فرض نیست" (فتاوی عزیزی صفحہ ۵۲)

ہندوستان میں ربا کے جواز کی نسبت شاہ عبد العزیز صاحب کا فتوےٰ

مندرجہ بالا فتوے سے ظاہر ہے کہ جبکہ ہندوستان میں مسلمانوں کو پورا امن ہے اور مذہب میں یہانتک آزادی حاصل ہے کہ وہ تحریر و تقریر میں سلطنت کے مذہب پر علانیہ اعتراضات کر سکتے ہیں تو یہاں سے مسلمانوں کے لیے ہجرت کرنا فرض نہیں ہے مگر بوجہ اس کے کہ یہاں غیر مسلموں کی حکومت ہے اُنھیں کا قانون جاری ہے یہ ملک کسی طرح دار الاسلام نہیں قرار دیا جا سکتا ہے بلکہ یہ دار الامن ہے جو دار الحرب کی ایک قسم ہے۔ خود مولانا شاہ عبد العزیز صاحب محدث دہلوی نے ہندوستان کی نسبت صاف طور پر ارشاد فرمایا ہے کہ "یہاں مسلمانوں کے امام کا حکم ہرگز جاری نہیں ہے نصاریٰ کے حکام کا حکم بے دغدغہ جاری ہے اور احکام کفر کے جاری ہونے سے یہ مراد ہے کہ مقدمات، انتظام سلطنت و بندوبست رعایا و تحصیل خراج و باج و عشر اموال تجارت میں حکام بطور خود حاکم ہوں اور ڈاکوؤں اور چوروں کی سزا اور رعایا کے باہمی معاملات اور جرموں کی سزا کے مقدمات میں غیر مسلموں کا حکم جاری ہو اگرچہ بعض احکام اسلام مثلاً جمعہ و عیدین و اذان وغیرہ میں غیر مسلم تعرض نہ کریں" (فتاوی عزیزی اُردو حصہ اول صفحہ ۳۴)

دوسرے موقعہ پر شاہ عبد العزیز صاحب موصوف نے تحریر فرمایا ہے کہ "جب نصاریٰ کا ملک دار الحرب ہوا تو اس ملک میں غیر مسلموں سے سود لینا اور غیر مسلموں کو سود دینا بھی جائز ہوا۔ اس واسطے کہ ہدایہ میں مذکور ہے وَلَا رِبٰوا بَیْنَ الْمُسْلِمِ وَالْحَرْبِیِّ فِیْ دَارِ الْحَرْب

یعنی مسلمان اور غیر مسلم حربی کے درمیان دار الحرب میں سود حرام نہیں ہے اور یہ قاعدہ ہے کہ روایات میں جو حکم مطلق ہوتا ہے وہ عام ہوتا ہے تو دونوں صورتیں یعنی سود لینا اور دینا حرمت کی نفی میں داخل ہوئے لیکن مسلمانوں کو چاہیے کہ غیر مسلم حربی کو سود دینے میں احتیاط کرے بلا ضرورت غیر مسلم حربی کو کبھی سود نہ دیوے۔ (فتاوی عزیزی اردو حصہ اوّل صفحہ ۸۰)

اس فتوے میں شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے صاف الفاظ میں مسلمانوں کا ہندوستان میں سود لینا اور دینا جایز قرار دیا ہے بلکہ بلا ضرورت سود دینے کو منع کیا ہے۔ مگر کس قدر عجیب بات ہے کہ مسلمانوں نے ہندوستان میں سود لینے سے قطعاً احتراز کیا اور بلا ضرورت سود دینے میں اس قدر مبالغہ کیا کہ اس سے تمام قوم تباہی کے گڑھے میں گری چلی جا رہی ہے۔

ایک اور موقعہ پر حضرت شاہ عبد العزیز صاحب رح نے حسب ذیل استفتار کے جواب میں ارشاد فرمایا۔

سوال۔ در عملداری نصاریٰ کہ اہل اسلام مبالغ نزد نصاریٰ جمع مے سازند و سود آں از نصاریٰ مے گیرند و آں را وثیقہ مے نامند درست است یا نہ۔

جواب۔ در دار حرب میان مسلم و کافر حربی معاملہ ربوا درست است چنانچہ در کفایہ مے آرد وَلَا رِبٰو بَیْنَ الْمُسْلِمِ وَالْحَرْبِیِّ فِیْ دَارِہٖ انتہی و عملداری نصاریٰ بنا بر مذہب صاحبین بہ سبب آنکہ شعائر کفر بے دغدغہ باعلان رواج گرفتہ دار حرب است پس وثیقہ درست است و بنا بر مذہب امام اعظم علیہ الرحمۃ دار اسلام کہ دار حرب میشود مشروط است بہ شروط ثلثہ بر تقدیر تحقق شروط ثلثہ عملداری نصاریٰ البتہ دار حرب خواہد گشت و وثیقہ جایز خواہد شد" (فتاوی عزیزی فارسی جلد سیوم صفحہ ۹۵)

نہ صرف وہ مقامات جن میں غیر مسلموں کی عملداری ہو دار الحرب ہیں بلکہ ایک صورت ایسی بھی ہے کہ کسی مقام میں آبادی بھی مسلمانوں کی ہو اور حکومت بھی مسلمانوں کی ہو تاہم وہ مقام دار الحرب ہو۔ مثلاً حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد خلافت میں یربوع کے لوگوں نے جب

زکوٰۃ دینے سے انکار کیا تو آپ نے اسے دار الحرب قرار دیدیا۔ حالانکہ وہاں مسلمانوں کی آبادی تھی مسلمانوں کی حکومت تھی اور اسلام کے علاوہ دیگر احکام جاری تھے۔

اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جہاں اسلام کا صرف ایک حکم بھی جاری نہ ہو وہ دار الحرب ہے اور وہاں نہ صرف ربح یا تجارتی سود کا جس کو انگریزی میں انٹرسٹ کہتے ہیں لینا اور دینا جائز ہے بلکہ تمام اقسام کے سود اور سود در سود جو مسلمانوں کو دینے پڑتے ہیں وہ بھی لینے جائز ہیں جزاء سیئۃ سیئۃ مثلہا

دار الحرب میں جواز ربا کی مصلحت

ایک شبہ یہ وارد ہوتا ہے کہ جب ربا قطعی طور پر حرام قرار دیدیا گیا تو ان مقامات میں جہاں احکام اسلام جاری نہ ہوں غیر مسلموں کے ساتھ ربا کا لین دین کیوں جائز کیا گیا ہے۔ اس کی مصلحت صاف یہ ہے کہ ایسی جگہ اگر کوئی غیر مسلم مسلمانوں سے سود لے تو مسلمان اسے روکنے کی طاقت نہیں رکھتے جس سے مسلمانوں کو سراسر نقصان پہونچتا ہے۔ اس نقصان کی تلافی اس طرح کی گئی کہ مسلمانوں کو بھی اجازت دیدی گئی کہ وہ اپنی حفاظت کے لیے ایسے مقامات میں غیر مسلموں سے سود لیں پس مسئلہ مذکور کی رو سے ان تمام مقامات میں جہاں مسلمانوں سے سود وصول کیا جا سکتا ہے وہ غیر مسلموں سے سود لے سکتے ہیں خواہ وہ اسلامی ممالک ہوں یا غیر اسلامی مگر کچھ تو احتیاط اور کچھ رسم و رواج کی وجہ سے وہ کہیں بھی غیر مسلموں سے سود نہیں لیتے۔ احتیاط کی تو یہ حالت تھی کہ باوجودیکہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سود کی تعریف کے بارہ میں شک ہونے کی وجہ سے کوئی رائے قایم نہ کر سکے تھے تاہم شعبی سے روایت ہے کہ آپ نے (یعنی حضرت عمرؓ نے) فرمایا کہ "ہم نے ربا سے ڈر کر دس میں سے نو حصے حلال بھی چھوڑ دیا ہے" آپ کے زمانے میں مسلمانوں میں دولت کی یہ کثرت تھی کہ لوگ شہر کی گلیوں میں جھولیوں میں سونا بھر کر پکارتے پھرا کرتے تھے اور کوئی لینے والا نہ ملتا تھا تو اس زمانہ میں سود پر روپیہ کس کو دیا جاتا پس ظاہر ہے کہ ان دونوں وجوہ سے ہر قسم کا پرہیز نہایت سہل تھا۔ اس کے بعد کے زمانہ میں قومی سلطنت کی وجہ سے مسلمانوں کے لیے ذرائع معاش کھلے تھے اس لیے

وہ زر کا کاروبار کرنے پر مجبور نہ تھے۔ ہندوستان کی سلطنت کے زمانہ میں شاہی خزانہ اور اُس کا حساب کتاب بھی زیادہ تر دیگر اقوام کے ہاتھ میں رہتا تھا۔ ان تمام امور نے ملکر مسلمانوں پر ایسا اثر ڈالا کہ وہ اُن تمام پیشوں سے جن کا تعلق روپیہ اور سرمایہ سے ہی بالکل دور جا پڑے سود کا لین دین صرف مسلمانوں کے مذہب میں ممنوع نہ تھا بلکہ جیسا کہ اوپر مذکور ہوا ہندوؤں یہودیوں اور عیسائیوں سب کی آسمانی کتابوں کی رو سے یکساں ممنوع تھا۔ مگر مندرجہ بالا وجوہ سے مسلمانوں کو سرمایہ اور سود سے روز بروز دوری اور نفرت ہوتی گئی حتیٰ کہ مسلمانوں میں سرمایہ دار، اور سود خوار اس قدر حقارت سے دیکھے جاتے ہیں کہ اس کی نظیر دنیا میں مشکل سے ملے گی۔ مسلمانوں کے نزدیک کوئی شخص قتل و غارتگری کرے بیواؤں اور یتیموں کا مال ہضم کرے مگر مرتے وقت ان گناہوں کے کوئی آثار اس شخص پر نمایاں نہیں ہوتے البتہ اگر سود کھائے تو مشہور یہ ہی کہ اوّل تو اس دنیا میں اُسے فلاح نہیں ہوتی اور آخر وقت میں اُس کا منہ خنزیر کا سا ہو جاتا ہی اور اُس کی قبر میں سے دھواں اُٹھا کرتا ہی مگر تعجب ہی کہ دیگر مذاہب کے سود خواروں کا یہ انجام ہونا مشہور نہیں ہی حالانکہ اُن کے ہاں بھی سود خوری کچھ کم ممنوع نہیں ہی۔

زمانہ سابق کی بلا کرایہ اشیا

اس قسم کی روایتوں نے مسلمانوں پر ایسا گہرا اثر کیا ہی کہ اب وہ سود کے بارہ میں نہ اپنے نفع نقصان کو دیکھتے ہیں اور نہ کسی کی سنتے ہیں حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب نے سو برس کے قریب ہوئے ہوں گے صاف الفاظ میں فتویٰ دیدیا تھا کہ اس ملک میں ہر قسم کا سود جائز ہی۔ اس اثنا میں مسلمانوں کے لاکھوں خاندان اور اُن کی کروڑوں کی جائدادیں تلف ہو چکیں مگر وہ اب تک اپنی بات پر اڑے ہوئے ہیں لیکن جہاں تک خیال کیا جاتا ہی روپیہ کی قیمت اور اُن کا صحیح مصرف نہ معلوم ہونے سے مسلمانوں میں یہ تمام غلط فہمیاں موجود ہیں۔ دنیا میں کثرت سے ایسی چیزیں ہیں جن کی اہمیت میں ابتدا و زمانہ کے ساتھ غیر معمولی تبدیلی ہوگی۔ مثلاً پہلے زمانہ میں امیر آدمی غریبوں کے کھانے کے لیے پھلوں کے درخت لگاتے تھے مگر اب سڑکوں تک کے درختوں کے پھل فروخت ہوتے ہیں۔

شادیوں میں کھانا پکانے کے برتن اور فرش وفروش سب عاریتاً ملا کرتے تھے۔ اب یہ چیزیں بڑے شہروں میں کرایہ پر لینی پڑتی ہیں۔ قبر کھودنا، کفن سینا، مردے اُٹھانا سب پہلے زمانہ میں مفت تھا۔ اب بڑے مقامات میں جنازہ اُٹھانے کے لیے مزدور کرنے پڑتے ہیں مریضوں کا علاج کرنے قرآن شریف اور علم دین پڑھانے امامت کرنے، وعظ کہنے میلاد شریف پڑھنے کا معاوضہ لینا ناجائز تھا مگر اب تمدن کی ترقی نے مجبور کر دیا ہے کہ ان خدمات کا معین معاوضہ لینا جائز رکھا جائے۔ اسی قسم کی ہزاروں چیزیں پہلے زمانہ میں مفت، بلا معاوضہ اور بلا کرایہ تھیں مگر اب شہروں میں جا کر دیکھیے کہ ہر ادنیٰ سے ادنیٰ چیز اور خدمت کا معاوضہ روپیہ کی صورت میں دینا پڑتا ہے۔ پھر روپیہ نے کیا قصور کیا ہے کہ اُسی کا کرایہ دینا اور لینا اب بھی معیوب اور ناجائز رہے۔ اب تو تقسیم عمل نے یہ سہولت پیدا کر دی ہے کہ جن لوگوں کے پاس پس انداز روپیہ ہو وہ کارخانوں اور کمپنیوں کے سپرد کر کے بے کھٹکے ملک کی تجارت میں گھر بیٹھے شریک ہو سکتے ہیں اور روپیہ کو ایک منٹ کے لیے بیکار نہیں چھوڑ سکتے۔ البتہ یہ مسلمانوں کی اپنی سمجھ ہے کہ وہ اُسے بیکار سمجھ کر نہ صرف اپنی ذات کو بلکہ اپنی اولاد کو ہلاکت میں ڈالنے کے سامان کر رہے ہیں۔

باب چہارم

مسلمانوں کا مستقبل

قرضداری کے کچھ اعداد

پچھلے باب میں مذہبی اعتبار سے سود کا جواز ثابت کرنے کی کوشش کی گئی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ سود دینے میں مبالغہ کرنے اور سود لینے سے احتراز کرنے سے مسلمانوں کی مالی حالت پر کہاں تک اثر پڑ رہا ہے اور اگر یہ حالت جاری رہی تو آئندہ انھیں کیا پیش آنے والا ہے۔ یہ مانی ہوئی بات ہے کہ دنیا میں کوئی چیز

سکون کی حالت میں نہیں رہتی، بلکہ ہر دم آگے بڑھتی یا پیچھے ہٹتی رہتی ہے، مسلمان اپنی مالی حالت سے بے پرواہ ہو گئے ہیں تو یہ ممکن نہیں کہ جو حالت ان کی اس وقت سے سو سال قبل تھی وہی اب بھی ہو، اس کا ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ نہ صرف مسلمانوں کی زمینداریاں بلکہ ان کی سلطنتیں بھی اس دوران میں بے تدبیری کا شکار بن چکی ہیں۔ کل قوم کے مالی تنزل کا اندازہ کرنا نہایت مشکل ہے، البتہ بنگال کی نسبت اخبار وطن میں ۱۹۰۳ء میں ایک صاحب نے اندازہ کیا تھا کہ وہاں ہر مسلمان اوسطاً چالیس روپیے کا مقروض ہے۔ سود کی شرح اس صوبہ میں دو روپے سے پانچ روپیہ فی صدی ماہوار تک ہے اور بعض صورتوں میں دس روپیہ اور پندرہ روپے تک ہو جاتی ہے۔ اندازہ یہ ہے کہ بنگال کے تین کروڑ مسلمان تیس کروڑ روپیہ سالانہ سود دیتے ہیں۔ وہاں ہر روز اوسطاً تین سو مسلمانوں پر سود کی ڈگریاں ہوتی ہیں۔ ایک سال کا یہ اندازہ کیا گیا ہے کہ ایک لاکھ اکتیس ہزار سات سو چھپن آدمی قرضہ کے شکار رہتے۔ یہ تباہ کن سلسلہ سالہا سال سے جاری ہے اور اگر اس میں کوئی کمی ہے تو اس وجہ سے نہیں کہ مسلمان پہلے سے زیادہ دولتمند ہو گئے بلکہ ان کی قرضہ لینے کی حیثیت بھی گھٹ گئی ہے۔ اسی قسم کا ایک نقشہ خواجہ غلام الثقلین صاحب مرحوم نے تاریخ قانون سود میں صوبہ متحدہ کے سرکاری کاغذات بابت ۱۹۱۲ء سے اخذ کر کے درج کیا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عدالتہائے دیوانی سے اصل سے کتنے گونہ سود کی ڈگریاں قرضخواہوں کو دی گئیں۔ اس نقشے میں سے صرف عدالت ججی علیگڈھ کے اعداد ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں۔

زر اصل	زر ڈگری	اصل سے کتنے گونہ ڈگری ہوئی
۱۰۰ روپیہ	۲۱۲۰ روپیہ	۲۱ گونہ
۲۵ روپیہ	۶۰۰ روپیہ	۲۴ گونہ
۲۰۰ روپیہ	۴۸۲۶ روپیہ	۲۴ گونہ
۶۵ روپیہ	۲۱۵۳ روپیہ	۳۲ گونہ
۵۰ روپیہ	۲۰۱۵ روپیہ	۴۰ گونہ
۹۹ روپیہ	۶۰۰۰ روپیہ	۶۰ گونہ

اس نقشہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ بعض صورتوں میں ایک روپیہ کے بدلے ساڑھے روپئے تک مدیون کو دینے پڑے ہیں اور اسی کتاب میں خواجہ صاحب مرحوم نے ایک دعوے کا ذکر کیا ہے جس میں مدیون کو ایک روپیہ کے بدلے [illegible] روپیہ دینے پڑے۔ جس زمانہ میں خواجہ صاحب مرحوم نے سود محدود کرانے کے لیے یہ کتاب لکھی اس زمانہ میں عدالتیں قانوناً مجبور تھیں کہ پورے دعوے کی ڈگریاں دیں مگر خواجہ صاحب کی کوشش سے اُن کے انتقال کے بعد بالآخر ۱۹۱۸ء میں ہندوستان میں ایک قانون پاس ہوا جس کی رو سے عدالتیں سود کی مقدار کم کرنے میں اختیار تمیزی استعمال کر سکتی ہیں۔

خیر یہ اعداد جو نقل کیے گئے صرف وہ ہیں جن میں باقاعدہ نالشیں ہوئیں اور مدیونوں پر ڈگریاں ہوئیں مگر لاکھوں معاملات ایسے ہیں جن میں رجسٹری شدہ یا بلا رجسٹری دستاویزیں لکھی جاتی ہیں یا محض زبانی معاملے ہوتے ہیں اور نالشوں کی نوبت نہیں آتی اور آدھ آنے اور ایک آنے اور دو آنے فی روپیہ سود دیا جاتا ہے اور ماہوار سود ادا نہ ہو تو سود در سود ہو جاتا ہے۔ اس قسم کا سود نہ صرف مرد بلکہ پردہ نشین عورتیں اور نہ صرف تنگدست بلکہ خوشحال عورتیں اپنے زیور پر ادنیٰ ضرورتوں کے لیے لیتی ہیں۔ اسطرح صدیوں سے اس ملک میں ایک عجیب قسم کا دریا بہہ رہا ہے جس میں بجائے پانی کے مسلمانوں کی جائدادیں رہن، بیع اور نیلام کی شکل میں بہی چلی جاتی ہیں۔ پانی تو بھاپ اور بادل بنکر واپس آجاتا ہے اور ملک کے کسی نہ کسی حصہ کو سیراب کرتا ہے مگر مسلمانوں کا مال جو بہہ کر چلا جاتا ہے اُس کی واپسی کی کبھی کوئی صورت ہی نہیں اس لیے کہ انھوں نے اُس دریا کے مخرج پر اوہام و تعصبات کی ایسی ایسی زبردست دیواریں مثل کوہ ہمالیہ کے کھڑی کر دی ہیں کہ اس کے پار کسی طرح بادل بھی نہیں جاسکتے۔

پس اگر وہ خشک سالی اور مفلسی اور ناداری اور کم مائگی سے ہلاک ہوں تو خود اُن دیوار بنانے والوں کا قصور ہے نہ کہ اُن کے مذہب اور اُن کے پیشواؤں کا۔

دریا، بادل اور پہاڑ کی جو تمثیلات دی گئی ہیں اُن میں ذرہ بھر مبالغہ نہیں ہے بلکہ وہ مسلمانوں کے بالکل حسب حال ہیں کیونکہ مال و دولت کی بارش رک گئے سے ان کی تمام قوم پر دائمی خزاں آگئی ہے اور

اُن کا کوئی پیشہ اور کوئی شعبہ ایسا نظر نہیں آتا جس میں سرسبزی کے کوئی آثار باقی رہے ہوں۔
چنانچہ ہم ذیل میں چند اہم شعبوں پر نظر کرتے ہیں۔

فصل اول

مختلف پیشوں میں مسلمانوں کا انحطاط

زمینداری و کاشتکاری

اس رسالہ کے ابتدائی حصہ میں مال کی جو قسمیں بیان کی گئی تھیں اُن میں ترتیب کے اعتبار سے سب سے اول نمبر زمین کا ہے اور اس کے حصول میں جس سرعت کے ساتھ مسلمانوں نے ترقی کی اس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں کم ملے گی۔ انھوں نے اپنی قوت بازو سے دنیا کے بڑے بڑے ملکوں کو فتح کیا۔ ان مفتوحہ ممالک کا نظم و نسق بادشاہ کے ہاتھ میں تھا جس کو سلطنت کہتے ہیں اور اس کے اجزا ترکیبی جاگیرداری اور زمینداری کی شکل میں قوم کے ہاتھ میں تھے۔ اس حالت کو مسلمانوں نے اُس وقت تک قایم رکھا جب تک کہ اس کے قایم رکھنے کے لیے قوت بازو کی ضرورت تھی۔ مگر انقلابات زمانہ نے دنیا میں ایک اور قوت از تام سرمایہ پیدا کردی۔ یہ قوت رفتہ رفتہ سب قوتوں پر غالب آگئی اور اُسی کے ذریعہ سے ملک گیری اور ملک داری ہونے لگی۔ چنانچہ موجودہ ہندوستان، سرمایہ اور تجارت کے ذریعہ سے فتح کیا گیا۔ مگر بدقسمتی سے مسلمانوں کو زر کے کاروبار، تجارت، اور سرمایہ پیدا کرنے سے نفور تھا اس لیے اُن کے مقبوضہ ممالک اُن کے ہاتھوں سے نکلنے لگے زمینداری جو سلطنت کا بچہ تھی وہ بھی مضمحل ہوتی گئی کیونکہ اس کے قایم رکھنے کے لیے بھی وہی قوت درکار تھی جو سلطنتوں کو قایم اور باقی رکھتی ہے۔ اور انجام کار زمینداری کا بڑا حصہ ان لوگوں کی طرف منتقل ہوگیا اور ہو رہا ہے جو سرمایہ دار ہیں اور زر کا کاروبار کرتے رہتے ہیں۔

زمانہ سابق میں زمین کی پیداوار تمام ضروریات کی کفیل ہوتی تھی اور نقد روپے کا بہت کم کام پڑتا تھا۔ اب قدم قدم پر روپے کی ضرورت ہے۔ مسلمان زمینداروں کے پاس سال میں صرف دوبار منتشر طور پر روپیہ آتا ہے۔ کاشتکاروں کے پاس جو بقایا رہتی ہو اُسے وصول کرنے کے لیے عدالت میں خرچ کرنا پڑتا ہے۔ دوسری قوم کے لوگ غیر وصول شدہ روپیہ پر سود لگاتے ہیں مسلمان سود نہیں لگا سکتے جو روپیہ وصول ہوتا ہے وہ یکسانیت کے ساتھ سال بھر صرف کیا جائے تب گزر ہو سکتا ہے مگر یہ صرف اُن لوگوں کے لیے ممکن ہے جو روپیے کو رکھنا جانتے ہوں اور رکھنا صرف وہ لوگ جان سکتے ہیں جو اُس کی بازاری اور استعمالی قیمت سے واقف ہوں۔ پس بیماری، شادی، غمی، خشک سالی، مقدمہ بازی اور دوسرے اتفاقی حادثات کی وجہ سے انھیں سودی قرضہ لینا پڑتا ہے جو بالآخر اُن کی تمام جائداد کو لے بیٹھتا ہے۔ خاص مستثنیات کو چھوڑ کر زمینداروں میں صرف وہ لوگ قرضہ سے محفوظ ہیں جو غلہ کا یا روپیے کا کاروبار کرتے ہیں۔ چونکہ مسلمان بہ حیثیت قوم کے زر کے کاروبار سے محترز ہیں اس لیے زیادہ تر قرضداری میں اُن کی جائدادیں نکل رہی ہیں۔ یا اولاد در اولاد تقسیم ہوتے ہوتے ملکیں رہ گئی ہیں اِن ملکوں کے بعد کاشتکاری کا نمبر آتا ہے اور کاشتکاری کی بدولت، دھوپ میں کام کرنے سے بڑے بڑے گھرانوں کی اولادوں کی صورتیں تک بدل جاتی ہیں۔ کاشتکاری میں اُن کی حالت اور زیادہ بدتر اس لیے ہوتی ہے کہ صدیوں سے اُن کا تمدن بڑھا ہوا رہا ہے اور وہ زیادہ خرچ کرنے کے عادی ہیں۔ برخلاف اس کے دیگر اقوام کے کاشتکاروں کی حالت نسبتاً بہتر ہے کیونکہ اُن کے ہاں روپیے کا رکھنا اور بڑھانا معیوب نہیں ہے۔ بلکہ اس زمانہ میں پرانے کاشتکاری پیشہ لوگ سرعت کے ساتھ زمیندار اور ساہوکار بن رہے ہیں۔ اور اُن کی حالت اُن مسلمان زمینداروں سے بدرجہا بہتر ہے جو اوپر سے نیچے کو اُتر رہے ہیں۔

ایسے تباہ حال زمینداروں کی حالت کاشتکاروں سے بدرجہا زیادہ خراب ہے جو بالعموم قصبات میں رہتے ہیں۔ روپیہ پیدا کرنے کے معقول ذرائع کو چھوڑ کر وہ خانہ جنگی مقدمہ بازی اور کچہریوں کی حاضری میں اپنا وقت صرف کرتے ہیں اور ان وسائل سے جب ضروریات پوری نہیں ہوتیں تو

کیمیا، اکسیر، دستِ غیب، الوپ انجن اور کشائش رزق کے وظیفوں کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں۔

بہرحال جو رفتار مسلمان زمینداروں کے تنزل کی اس وقت ہے اگر وہ جاری رہی اور اُسے روکنے کی کوئی تدبیر نہ کی گئی تو اندیشہ یہ ہے کہ "زمینداری" جو مدت دراز تک مسلمانوں سے مخصوص رہی ان میں سے بالکل مفقود ہو جائے اور اُن کی حالت دوسری قوم کے کاشتکاروں سے بدتر ہو جائے۔

صنعت و حرفت باب اول کی فصل دوم میں عرض کیا گیا ہے کہ زمین اور اس کی پیداوار پر تصرف کرنے اور اسے کارآمد صورتوں میں تبدیل کرنے سے "صنعت و حرفت" کا پیشہ وجود میں آیا۔

مختلف عناصر پر حصول اقتدار اور انسانی ضرورت اور راحت کی جتنی چیزیں ایجاد اور فراہم ہوئی ہیں وہ سب اسی کے تحت میں آتی ہیں۔ مسلمانوں کے موجودہ انحطاط کے زمانہ میں بہ مشکل خیال نہیں ہوتا کہ ان امور میں اُن کا بھی کوئی حصہ رہا ہو گا مگر یورپ کی بعض تصانیف سے اس کا کچھ پتا چلتا ہے۔

چنانچہ انگرسول نے جو اس زمانہ کا ایک غیر متعصب عالم ہے لکھتا ہے کہ

"دسویں صدی عیسوی میں سیراسینس نے منگولیا، فارس، عراق، شام، مصر، شمالی افریقہ، مراکو، اور اسپین میں کالج قایم کیے۔ اُن کے ممالک کی وسعت اہل روما کی سلطنت سے زیادہ تھی۔ اُن کے ہاں نہ صرف کالج تھے بلکہ رصد گاہیں بھی تھیں۔ انھوں نے اعشاریہ کا استعمال بتایا۔ جبر و مقابلہ اور علم مثلث کی تعلیم دی۔ وہ پیمایش کے فن کے ماہر تھے انھوں نے ستاروں کے نقشے اور جنتریاں بنائیں۔ تمام بڑے ستاروں کے نام رکھے جو اب تک مشہور رہیں انھوں نے زمین کی جسامت کا تخمینہ کیا۔ زمین کی گردش کے راستہ کا پتا لگایا۔ اور سال کے زمانہ کا تعین کیا انھوں نے چاند اور سورج گرہن اور سیاروں اور ستاروں کی گردشوں کے حسابات مرتب کیے

علم نجوم کے آلات بنائے مختلف قسم کی گھڑیاں اور اُن کے لنگر ایجاد کیے علم کیمیا کی بنیاد ڈالی۔ گندھک اور شورے کے تیزاب اور الکحال (جو شرابوں کا جوہر ہوتا ہے اور دواسازی کا جزو اعظم ہے) ایجاد کیا۔

انھوں نے سب سے اول مخزن الادویہ اور دواسازی کی کتابیں شائع کیں۔ علم ثقیل میں انھوں نے گرنے والے اجسام کے قوانین دریافت کیے۔ وہ مشینوں کی قوت کے استعمال اور کشش اجسام اور کشش زمین کو سمجھتے تھے انھوں نے علم ماسیات کی تعلیم دی اور اجسام کے اوزان متناسبہ دریافت کیے۔ روشنی کے علم میں انھوں نے یہ دریافت کیا کہ شعاعیں آنکھ سے اجسام پر نہیں پڑتیں بلکہ اجسام سے آنکھ پر پڑتی ہیں وہ روئی، چمڑہ، کاغذ اور اسپات کے بڑے دستکار تھے۔ انھوں نے شطرنج کا کھیل ایجاد کیا۔ انھوں نے بڑے بڑے افسانے اور ناول تحریر کیے۔ اپنے مدرسوں میں انھوں نے زمانہ حال کے اصول ارتقاء کی تعلیم دی۔ اور اس طرح وہ ڈارون اور اسپنسر کے پیشرو بنے۔ یہ لوگ عیسائی نہ تھے بلکہ مسلمان تھے۔ عیسائی اُس زمانہ میں سیاروں کے راستے دریافت کرنے والوں کی زبانیں گدیوں سے کھنچوا دیا کرتے تھے۔ فلسفیوں کی آنکھیں نکلوایا کرتے تھے۔ بہرحال ہم مسلمانوں کے نہایت احسانمند ہیں جو حضرت محمدؐ کے پیرو تھے اس لیے کہ وہ زمانہ حال کے سائنس کے بانی تھے۔

اِن اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ گھڑی سازی، دواسازی، مشینوں کے استعمال روئی، چمڑہ، کاغذ اور لوہے کی دستکاریوں سے مسلمان نہ صرف واقف تھے بلکہ اُن میں سے بہت سی چیزوں کے موجد تھے اور اپنے گردوپیش کی اقوام سے بہت زیادہ بڑھے ہوئے تھے ایک نہایت غور طلب امر یہ ہے کہ کس چیز نے انھیں آگے سے پیچھے کر دیا اور نہ صرف پیچھے کر دیا بلکہ اس میدان سے انھیں بالکل خارج کر دیا۔ جہاں تک ہماری سمجھ کام دیتی ہے مسلمانوں نے سب قسم کی ایجادیں کیں مگر اُن ایجاد کی ہوئی اشیاء کو تیار کر کے کثرت سے دنیا میں پھیلانے کے وسائل

ذرائع اُس زمانہ میں نہ تھے۔ کتنا ہی کوئی شخص دولتمند کیوں نہ ہو مگر وہ اتنا بڑا سرمایہ دار نہیں ہو سکتا
کہ کوئی سامان اس کثرت سے تیار کرے کہ وہ تمام دنیا کے بازاروں میں پھیل جائے۔ یہ صرف اُس
صورت میں ممکن ہے، بہت سے لوگوں کی دولت ملکر اس قسم کے کام کرے۔ مسلمانوں میں اپنی
دولت، نفع کمانے کی غرض سے دوسروں کو معین منافع پر دینے کا رواج نہ تھا۔ پس تمام ترقیاں
اور تمام ایجادیں خود مسلمانوں کو پورا نفع نہ دے سکیں۔ البتہ جب اُن کی صحبت سے دنیا کی دوسری
قوموں نے ان کی ایجاد کی ہوئی اشیا سے واقفیت حاصل کی تو بوجہ اس کے کہ ان کے
ہاں بازاری نرخ پر روپے کو کرایہ پر دینا معیوب نہ تھا اُنھوں نے مشترک سرمایہ سے کمپنیاں
اور کارخانے قایم کرکے خوب نفع اُٹھایا۔ نہ صرف اپنے ملکوں میں بلکہ دیگر ممالک میں جاکر ریلیں نکالیں
کارخانے قایم کیے۔ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ کسی کمپنی میں روپیہ دیکر حصہ دار بنجانا مسلمانوں میں
کہاں ممنوع ہے، مگر ریلوں کی تاریخ دیکھنے سے واضح ہوگا کہ جب تک کہ گورنمنٹ نے سرمایہ داروں
کو یہ اطمینان نہیں دلایا کہ اُن کے روپیہ پر کم سے کم اس قدر سود لازمی طور پر دیا جائے گا۔
اُس وقت تک ریلوں وغیرہ کے لیے سرمایہ داروں سے روپیہ نہیں ملا۔ جس کے معنے یہ ہیں کہ
حصہ داروں نے یہ اطمینان کرلیا کہ اُن کے سرمایہ پر مثلاً کم سے کم چھ فی صدی منافع ضرور ملیگا
مسلمان ایسے معاملات سے ناواقف تھے اور جب دنیا میں ایسے معاملات کا وجود ہوا تو
نہ اُنھوں نے اُن کو جائز قرار دیا۔

مسلمانوں کی ترقی و تنزل کی تاریخ میں کوئی واقعہ اس سے زیادہ اہم نہیں ہے جبکہ اُنھوں نے
سرمایہ کے استعمال کے طریقوں سے اعراض کیا۔ کسی بادشاہ کے مرنے کسی سلطنت کے
جانے کسی ملک کے اُجڑنے سے مسلمانوں کی قوم کو اتنا زبردست نقصان نہیں پہونچا جتنا اس
افسوسناک [illegible] سے پہونچا ہے۔ عیسائیوں کے مذہب اور نیز اُن کے رسم و رواج کی رو سے
ہر قسم کا سود ممنوع اور معیوب تھا۔ مگر اُن کے پادریوں نے خفیف شرح سود پر غربا کو روپیہ دینا خود
جاری کیا پھر رفتہ رفتہ اُن کی قوم میں سود اور سرمایہ کا دور دورہ ہوگیا۔ اسی طرح زمانہ سلف میں

امام مالکؒ نے خفیف سود کو جائز رکھا اور ہندوستان میں مسلمانوں کی بربادی کے زمانہ میں حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے اس ملک میں ہر قسم کا سود جائز قرار دیا مگر چونکہ مسلمانوں میں کاروبار و تجارت کا رواج کم تھا، اس لیے سود کے اجرا کی ضرورت محسوس کرنے والوں کی تعداد مسلمانوں میں نہایت کم رہی۔

کاش اس ضرورت کے محسوس کرنے والوں کی تعداد کچھ زیادہ ہوتی تو یہ روز بد مسلمانوں کو دیکھنا نہ پڑتا۔

بہر حال چونکہ مسلمانوں نے اپنی قوم کے افراد کے مشترک سرمایہ کو صنعت و حرفت کی ترقی میں صرف نہیں کیا اس لیے اس پیشہ میں ان کا صرف اس قدر حصہ ہے کہ ان کی قوم کے مفلس کاریگر کثرت کے ساتھ دوسری قوموں کے سرمایہ داروں کی غلامی میں کام کرتے ہیں۔ بعض دردمند مسلمان قوم کی بھلائی کے لیے دستکاری کے مدرسے جاری کرنے یا جاری کرنے کا مشورہ دیتے ہیں، مگر جب تک کہ ان کے پاس سرمایہ نہ ہو تو وہ دستکاری کے کارخانوں سے کیا نفع اٹھا سکتے ہیں اب بھی اکثر بڑے شہروں میں شال اور کپڑے اور برتنوں وغیرہ کی صنعت مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہے اور ان کے جدا گانہ کارخانے بھی نظر آتے ہیں مگر اندرونی حالت دریافت کرنے سے معلوم ہوگا کہ کاریگر سے لیکر کارخانہ دار تک سب سرمایہ داروں کے غلام ہیں جن سے وہ سود پر روپیہ لاتے ہیں۔

جب سے ہندوستان میں دستکاری کا چرچا ہے بدیہی طور پر مسلمان کاریگروں کی تعداد اور ان کی مزدوری کی شرح میں اضافہ ہو رہا ہے مگر اب جدید مصیبت یہ آرہی ہے کہ چونکہ وہ روپیہ کا رکھنا اور بڑھانا نہیں جانتے اس لیے وہ کثرت کے ساتھ فضول خرچی، عیاشی اور نشہ بازی میں مبتلا ہوتے جاتے ہیں اور یہ روز بروز مسلمان کاریگروں میں بڑھ رہی ہے۔

غرضکہ مسلمانوں پر سود کا مسئلہ حل نہ ہونے سے جس طرح ہر پیشہ میں ان کی حالت روز بروز زبوں ہوتی جاتی ہے۔ اسی طرح صنعت و حرفت میں بھی ہو رہی ہے۔

مختلف شہروں میں کانفرنسیں منعقد کرکے مرکزی اور مقامی تعلیم گاہیں قایم کرنے کا وعظ
مسلمانوں نے سالہا سال تک کہا۔ تاہنوز روز اول ہے۔ اس ملک کی دیگر اقوام کی جب
اس طرف توجہ ہوئی تو آناً فاناً اسکول اور کالج قایم کرکے کھڑے کر دیئے بعض ہائی سکول
مسلمانوں کی عمریں قایم کرتے کرتے گزر گئیں اور وہ ایک مکمل اسکول قایم نہ کر سکے۔

چنانچہ خاص ممالک متحدہ میں جہاں مسلمانوں کی تعلیمی تحریک کا مرکز ہے تیس سال کے
مسلسل وعظ اور کوشش کا نتیجہ یہ ہے کہ صوبہ کے باون ضلعوں میں صرف سات ہائی سکول
قایم ہوئے ہیں جن میں سے زیادہ ایسے ہیں جو مستقل سرمایہ نہ ہونے سے خطرہ کی حالت
میں ہیں۔

Nizamuddin Khan M.B.B.S. Ist yr. M.U. Aligarh

دوسری طرف صرف ضلع بلند شہر میں ہندوؤں نے تھوڑے عرصہ میں سات ہائی سکول
قایم کر دیے جن میں سے دو تمام صوبہ کے لیے نمونہ کے اسکول ہیں۔ ان میں سے بعض سکول
بغیر کسی شور و شغب اور تشہیر کے ایک ایک شخص نے قایم کر دیئے۔ اور وہ نہایت اعلیٰ
پیمانہ پر چل رہے ہیں۔ مسلمانوں کے مدرسوں کی خصوصیت یہ ہے کہ انھیں مقامی چندہ نہیں
ملتا اس لیے ان کے بانی تمام ملک میں اور تمام ریاستوں میں در بدر مارے مارے پھرتے ہیں۔
پھر بھی ان کی ضروریات پوری نہیں ہوتیں۔ اور ہندوؤں میں ایک ایک بیوہ عورت نے
اپنے روپیہ سے پورا ہائی اسکول قایم کر دیا ہے۔ تمام ہندوستان کے مسلمانوں نے
پورا زور لگا کر یونیورسٹی کے لیے تیس لاکھ روپیہ جمع کیا۔ اور کلکتہ میں صرف ڈاکٹر راش بہاری
گھوش نے محض علمی کیمیا کی تعلیم کے لیے اکیس لاکھ روپیہ دیدیا۔ اس وقت ہندوستان
میں ہر طرف تعلیم کا چرچا ہے۔ تمام گورنمنٹ اسکول، مشن اسکول، پرائیویٹ اسکول، ہندوؤں
کے اسکول سب کے سب تمام طور پر جملہ اقوام کے لیے کھلے ہوئے ہیں مگر ان میں مسلمان
بمنزلہ نفی کے ہیں۔ حالانکہ ہندوؤں کی بعض زراعت پیشہ اقوام جنہیں تعلیم و تعلم کا کام کبھی
نہیں ہوا [illegible] باندھ کر تعلیم کے پیچھے پڑ گئی ہیں۔ اور کثرت سے مدرسے اور بورڈنگ ہاوس

ان سے پر ہیں۔ برخلاف اس کے چند سال سے مسلمانوں کی خاص تعلیم کے لیے گورنمنٹ نے اپنے صرف سے صوبہ متحدہ میں ایک محکمہ قایم کیا۔ تاہم گزشتہ سال میں ابتدائی تعلیم میں مسلمان طلبا کی مجموعی تعداد ہر قسم کے ابتدائی مدارس میں بجائے ۱،۸۱،۶۳۲ کے ۱،۵۱،۲۲۶ رہ گئی یعنی ایک سال میں بقدر ۳۰،۴۰۶ طلبا کے گھٹ گئی۔ یہ اُن مدارس کا حال ہے جن میں گورنمنٹ کا مجوزہ نصاب پڑھایا جاتا ہے اور جن کی سند سے سرکاری نوکریاں ملتی ہیں۔ مگر ملک میں اب سیکڑوں مدارس پرائیویٹ تعلیم کے کھل گئے ہیں جن سے دیگر اقوام کے بچّے فیض یاب ہو کر مختلف پیشوں کے لیے تیار ہوتے ہیں۔ اس قسم کے مدارس پالی ٹکنکل انسٹیٹیوٹ کے نام سے بنگال میں کھلے ہیں جن میں بچوں کو نصف وقت پیشوں کی تعلیم دیجاتی ہے اور یہ سلسلۂ تعلیم یورپ کے نمونہ پر نہایت کامیابی سے چل رہا ہے۔ ان مدارس کے بچّے اگر درمیان میں کسی وجہ سے پڑھنا چھوڑ دیں تو معاش سے پریشان نہیں ہو سکتے۔ اس قسم کے مدارس قایم ہونے کا انحصار بالکل قومی سرمایہ پر ہے جس کا فراہم ہونا مسلمانوں کے امکان سے باہر معلوم ہوتا ہے۔ پس ان واقعات سے جو نتایج نکلتے ہیں وہ یہ ہیں کہ مسلمانوں میں تعلیمی تحریک ٹھنڈی پڑ کر اب رُک گئی کچھ اس وجہ سے کہ قوم کے پاس سرمایہ نہیں اور کچھ اس وجہ سے کہ اُن کے خیالات میں مفلسی اور دیگر اسباب نے انتشار پیدا کر کے اُنھیں تعلیم سے ہٹا دیا اس لیے قومی سرمایہ سے قومی تعلیم کا انتظام مسلمانوں سے ہونا بہ اسباب ظاہر مشکل ہو گیا ہے مگر اس سے زیادہ افسوس ناک امر یہ ہے کہ جو اسکول اور کالج اس وقت موجود ہیں اُن میں بھی مسلمان طلبا کا اطمینان کے ساتھ تعلیم پانا اس لیے مشکل ہو گیا کہ ایک طرف تو روزافزوں گرانی سے ہر قسم کے اخراجات بڑھ رہے ہیں۔ دوسری طرف مسلمانوں کے ذرایع معاش گھٹ رہے ہیں اور مسلمانوں کے طرز معاشرت اور مصرفانہ اخراجات میں کسی قسم کی کمی نہیں پس اسکولوں اور کالجوں میں بچوں کی تعلیم کی صرف یہ صورت ہے کہ قومی خدمت سے اُن کے اخراجات تعلیم کا انتظام کیا جائے اور موجودہ حالت میں قوم پر یہ ایک ایسا بار ہے جس کا متحمل ہونا اسے

گوارا نہیں ہی۔ پس نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہی کہ "تعلیم" جو مسلمانوں کے جملہ قومی امراض
کا سب سے آخر مگر سب سے زیادہ کارگر علاج سمجھی گئی تھی وہ بھی اب اون کے امکان سے
باہر ہوئی جاتی ہی۔

مذہب

جب سے مسلمانوں کو اپنے تنزل کا احساس ہوا ہی تب سے وہ اپنی مذہبی حالت
درست کرنے کی مسلسل کوششیں کر رہے ہیں کیونکہ انھیں معلوم ہی کہ ابتداءِ اسلام
میں مذہب نے انھیں قلیل عرصہ میں شتربانی سے جہانبانی تک پہونچایا تھا اُس وقت دیگر
مذاہب کے پیرو ریاضت و مجاہدہ کرنا، قوائے نفسانی کو مضمحل کرنا، اعضائے جسمانی کو سکھا دینا
خداوند تعالی کی خوشنودی کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ مگر اسلام نے لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْإِسْلَامِ
کا وعظ کہکر مسلمانوں کو دینی و دنیوی دولت سے مالامال کر دیا اور انہیں سلطنت کے تخت پر اس قدر
تھوڑے وقت میں متمکن کر دیا کہ دنیا کی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ دیگر مذاہب کی صداقت
کا معیار اُن کے پیروں نے جو کچھ بھی قرار دیا ہو مگر مسلمانوں نے عام طور پر سمجھ رکھا ہی کہ سچا مذہب
وہ ہی جو عقبیٰ کی درستی کے ساتھ دنیا کی درستی کرے۔ عقبیٰ کی درستی کا اندازہ اس زندگی میں نہیں
ہو سکتا ہے مذہب کی انتہائی ترقی جو مسلمانوں کے نزدیک ہو سکتی ہی وہ وہ ہی جو آنحضرت صلعم
اور صحابہ کرام کے زمانہ میں ہوئی۔

اب دیکھنا یہ ہی کہ آنحضرت صلعم کے زمانہ میں احکام خداوندی کی تعمیل سے مسلمانوں کو جو ترقی
حاصل ہوئی تھی وہ کن امور پر مشتمل تھی۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس زمانہ میں عبادت کرنے اور
احکام خداوندی بجالانے کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ مسلمانوں کے اخلاق عمدہ ہوگئے۔ انھوں نے اپنا
سب سے بڑا کام **اشاعتِ اسلام** قرار دیا جسکی وجہ سے وہ تمام دنیا میں پھیل گئے اور انہیں
دنیوی ثروت اور وجاہت حاصل ہوئی زمانہ حال میں جس قدر کتابیں زمانہ سلف کے متعلق لکھی
جاتی ہیں ان میں زیادہ تر انھیں تین امور کی تفصیل پائی جاتی ہی اور اکثر تصانیف کی غرض یہی ہوتا
ہی کہ ان کتابوں کو پڑھکر مسلمانوں میں وہ صفات پیدا ہوں جو سلف کے مسلمانوں میں تھیں۔

Nizamuddin Khan

تاریخی کتابوں کی تصنیف کے علاوہ گزشتہ سو سال میں مذہب کو زندہ کرنے کی بہت سی تحریکیں ہوئیں۔ بعض نے مسلمانوں کے تنزل کی وجہ یہ قرار دی کہ انھوں نے محض بزرگوں کے اقوال و افعال کو مذہب قرار دے رکھا ہی۔ بعض نے کہا کہ محض فقہ کی پیروی سے سخت نقصان پہونچا ہی اس لیے حدیث کو مذہب کی بنا قرار دے کر اس پر عمل کرنا چاہیے۔ اور بعض نے حدیث، فقہ، تصوف اور اقوال بزرگان کو مذہب کے خلاف قرار دیکر محض قرآن کو ہر مسئلہ کا ماخذ بنایا۔

مگر اب تک عقائد کا کوئی ایسا مجموعہ تیار نہیں ہوا جس کے اختیار کرنے سے مسلمانوں کے اخلاق، اُن کی ثروت، اور اُن کے مذہب کی اشاعت میں نمایاں ترقی ہوئی ہو نہیں بلکہ باہمی مذہبی مناظروں اور مخالفتوں سے اور زیادہ حالت خراب ہوتی جاتی ہی۔ باہمی مذہبی کشمکش سے تنگ آکر بعض جماعتوں نے خالص تبلیغ اسلام، اور اشاعت اسلام کے لیے انجمنیں قایم کیں مگر وہ بھی چند روز چلکر مضمحل اور مردہ ہو گئیں۔ بعض لوگوں کو یہ خیال ہوا کہ دیسی زبان میں عقائد اور دینیات کی کتابیں نہ ہونے سے مسلمانوں کو تنزل ہی اس لیے کثرت سے اُردو میں دینیات کے رسالے شایع ہو رہے ہیں اور بعض اخبارات میں مستقل طور پر مذہبی مضامین کے لیے کئی کئی کالم وقف ہیں۔ مگر باوجود ان تمام تدابیر کے مسلمانوں کی حالت بہتر نہیں ہوتی اور وہ عام طور پر سمجھتے اور کہتے ہیں کہ اُن کے تنزل کی وجہ یہ ہی کہ وہ اپنے اصلی مذہب پر عامل نہیں ہیں۔

اِس وقت جتنے آسمانی مذاہب دنیا میں موجود ہیں اُن سب میں نیا مذہب اسلام ہی اُس کی خوبیوں کے قایل نہ صرف مسلمان بلکہ دیگر مذاہب کے روشن خیال اشخاص ہیں۔ یورپ کے علما رلا اور یہ صاف الفاظ میں اسلام کی تعلیم کو دیگر مذاہب کی تعلیم پر ترجیح دیتے ہیں اور یہاں تک کہتے ہیں کہ تہذیب کے اعتبار سے مذہب عیسوی نے یورپ کو پیچھے ہٹا دیا اور مذہب اسلام نے دنیا کو آگے بڑھا دیا۔ جس آسمانی کتاب میں قانون اسلام اُترا ہی وہ اب تک نہ صرف یہ کہ کتابی شکل میں بجنسہ موجود ہی بلکہ لاکھوں مسلمانوں کے دماغوں میں محفوظ ہی۔ آنحضرت صلعم کا ایک ایک قول اور ایک ایک فعل احادیث میں موجود ہی اور مسلمانوں میں فقہ کا اتنا بڑا

Nizamuddin Khan M.B.B.S. I yr. 1963

تجارت

جو مال زمین سے پیدا ہوتا ہے یا ہاتھ سے تیار کیا جاتا ہے اُسے مختلف ممالک میں تقسیم کرنے کا نام تجارت ہے۔ یہ کام مدتوں مسلمانوں کے ہاتھوں میں رہا ہے حتیٰ کہ اب بھی غربی ہندوستان کی بندرگاہوں میں چھوٹی بحریوں میں کھجوریں بھرے ہوئے عرب کے باشندے نظر آتے ہیں جو پرانے زمانے کے عربوں کی تجارت کو یاد دلاتے ہیں۔ مگر یہاں ایک ہی بات عرض کرنی پڑتی ہے وہ یہ کہ تجارتی سود کے اختیار کرنے سے دوسری قومیں زمین سے آسمان پر پہونچ گئیں اور تجارتی سود سے بچنے کی وجہ سے مسلمانوں کی قوم آسمان سے تحت الثریٰ میں پہونچ گئی۔ سب کو معلوم ہے کہ یورپ اور امریکہ کے تاجروں کے مقابلہ میں بادشاہوں کی آمدنی ہیچ ہے اور اب جدید مقامات پر صرف تجارت کے ذریعہ سے سلطنتیں قایم کی جاتی ہیں۔ بیشک ہندوستان کی بندرگاہوں میں بڑے بڑے مسلمان تاجر کثرت سے نظر آتے ہیں مگر عرصہ ہوا ایک بار اخبار البشیر میں ایڈیٹوریل میں یہ ظاہر کیا گیا تھا کہ رنگون وغیرہ میں بڑے بڑے مسلمان تاجر، دیگر اقوام کے سرمایہ داروں کا روپیہ استعمال کرتے ہیں جس سے تجارت کی اصلی قوت دوسروں کے ہاتوں میں ہے اور زر کا کاروبار اختیار نہ کرنے سے مسلمان اب تجارت کے میدان میں روز بروز ہٹتے جاتے ہیں۔ باقی اندرون ملک میں تو صاف طور پر معلوم ہے کہ مسلمان دکاندار دوسری اقوام کا سرمایہ استعمال کرتے ہیں اپنے روپیہ کا رکھنا، اُسے بڑھانا دوسروں کو کرایہ پر دینا یہ سب وہ ناجائز سمجھتے ہیں۔ اسی سال میں ہندوستان میں صدہا جدید کمپنیاں قایم ہوئیں جنمیں اسّی نوے کروڑ کے قریب سرمایہ لگا ہے مگر مسلمانوں کا اس میں جو حصہ ہے اُسی سے تجارت میں اُن کی اہمیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ اب تک بعض تجارتیں مثل چمڑہ وغیرہ کے مسلمانوں سے مخصوص تھیں جنھیں اب دوسرے لوگ اختیار کرتے جاتے ہیں مگر کوئی تجارت بھی کیوں نہ ہو جب اُن میں مسلمانوں کا ذاتی سرمایہ نہیں لگتا تو وہ بھی ایک قسم کی غلامی ہے۔ اور چونکہ سرمایہ دار قومیں اب سرعت کے ساتھ تجارت کے ہر شعبہ پر حاوی ہوتی جاتی ہیں اس لیے اندیشہ یہ ہے کہ آئندہ زمانہ میں مسلمانوں کی تجارت

کی یادگار صرف ادنیٰ درجہ کے بساطیوں اور پھیری والوں میں رہ جائے گی۔

ملازمت

دنیا میں جتنے پیشے ہیں اُن کی تلچھٹ ملازمت ہے۔ تقرب سلطانی اور نظام سلطنت میں شرکت حاصل ہونے کی وجہ سے وہ بلاشبہ معزز ہے مگر جس قوم میں اُس کی زیادتی ہوا اس میں سے کسب معاش کی قابلیت یقینی طور پر گم ہو جاتی ہے اسی لیے ہم نے اُسے تمام پیشوں کی تلچھٹ سے تعبیر کیا ہے ہندوستان میں صدہا برس مسلمانوں کی قومی سلطنت رہنے کی وجہ سے ملازمت میں مسلمانوں کا غالب حصہ رہا ہے۔ تبدیل سلطنت کے بعد بھی دیوانی اور مالی اور انتظامی عہدوں پر عام طور پر مسلمان ہی نظر آتے تھے۔ مگر جا بجا سلطنت کی زبان سیکھنے میں تساہل کرنے سے وہ صیغۂ ملازمت سے خارج ہونے لگے۔ سر سید احمد خاں مرحوم کی تعلیمی تحریک نے انھیں بڑے عہدوں سے بالکل خارج ہونے نہیں دیا اور اب جو مسلمان اس پیشہ میں نظر آ رہے ہیں وہ زیادہ تر سر سید مرحوم کی بدولت ہیں۔ بعض لوگ اس بات پر معترض ہیں کہ علیگڈھ کالج نے صرف چند ملازم اور غلام پیدا کیے مگر اس کا الزام سر سید پر کسی طرح عاید نہیں ہوتا۔ سر سید نے کبھی مسلمانوں کو ملازمت کے لیے تیار کرنے کا دعوےٰ نہیں کیا بلکہ وہ تو مسلمانوں کو اعلیٰ تعلیم دلا کر "آسمان کا تارا" بنانا چاہتے تھے۔ اُن کا قول تھا کہ اول مسلمانوں کو تعلیم کے چشمہ سے سیراب کرو۔ پانی بھر کر خود اپنا راستہ تلاش کر لیتا ہے۔ اسی طرح مسلمان تعلیم پا کر خود اپنے لیئے راستے نکالیں گے انھیں خیالات کی وجہ سے وہ مسلمانوں کو ملازمت دلانے میں ساعی نہ تھے اور اسی لیے اُن سے بعض کو یہ شکایت تھی کہ وہ کالج کے فارغ التحصیل طلبا کو نوکری دلانے میں پہلو تہی کرتے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ اُس وقت تک مسلمانوں کا پیشہ زیادہ تر ملازمت تھا اور جابجا بے تعلیم ہونے کی وجہ سے وہ اُس پیشہ سے جس پر اُن کی زندگی کا دارومدار تھا، نکالے جا رہے تھے اور روٹی سے محروم کیے جا رہے تھے۔ سر سید نے اُس وقت مسلمانوں کو تعلیم دلا کر انھیں بھوکا مرنے سے روکا۔ کیونکہ اب تک ہم دیکھ رہے ہیں کہ جن خاندانوں میں نوکری بطور معاش

وہ نوکری نہ ملنے سے قطعاً برباد و تباہ ہو گئے ہیں۔ جو رفتار سر سید کی تحریک کی ابتدا
میں تھی اگر وہ جاری رہتی تو مسلمان ملک کے تمام معزز پیشوں میں داخل ہو گئے ہوتے مگر اس
تحریک کے رک جانے سے مسلمان اب محض ملازمت اور وکالت کے بھنور میں پھنسے ہیں۔ جو
تعلیم یافتہ اپنے منشا کے مطابق اعلیٰ عہدے پا جاتے ہیں انھیں رسم و رواج کے مطابق باہم
دنیا میں سب سے زیادہ دولتمند قوم کے لارڈوں اور نوابوں کا تمدن اختیار کرنا پڑتا ہے جس کے لیے
ان کی محدود آمدنی کافی نہیں ہوتی۔ بچپن سے وہ روپیہ کا بچانا اور بڑھانا سیکھتے نہیں کیونکہ یہ
کام ان کی سوسائٹی میں معیوب ہے۔ مہینہ میں اگر کوئی شخص تکلیف اٹھا کر سو پچاس روپیہ بچائے
تو ہر وقت اس سے کوئی جائداد نہیں خریدی جا سکتی۔ اور ماہ بماہ تھوڑا تھوڑا بچا کر گھر میں جمع
کیے جانا کوئی آسان کام نہیں۔ اس پر اعلیٰ درجہ کا تمدن۔ بچوں کی تعلیم، بیماری اور ضعیفی کے لیے
اثاثہ، یہ سب افکار جمع ہو کر دماغ میں ایک قسم کا اختلال پیدا کر دیتے ہیں یہ ان کا حال ہے جو
بظاہر کامیاب زندگی بسر کرتے ہیں اور جو لوگ سند حاصل کر کے عمدہ نوکری پانے میں کامیاب
نہیں ہوتے یا جو لوگ ادھوری تعلیم پاکر صرف جدید تمدن سے واقف ہو گئے ہیں یا جن کے
آبا و اجداد بڑے عہدہ دار تھے اور خود ادنیٰ درجہ کے اہلکار ہیں وہ تو "صورت ببیں حالش
مپرس" کے مصداق ہیں۔ یہ لوگ چند دنوں کی بیماری، یا معطلی، یا کسی اتفاقی حادثہ کے اخراجات
کے متحمل نہیں ہو سکتے اور ان کی لغت میں برخاستگی، موت، کی مرادف ہے۔ جیسا کہ مذکور
ہوا زمانہ سابق میں ملازمت کا پیشہ مسلمانوں سے مخصوص تھا مگر اب اس کے لیے جدید تعلیم کی
شرط ہے جس سے بالعموم مسلمان بے بہرہ ہیں، ان میں تعلیمی تحریک روز بروز کمزور ہو رہی
ہے۔ اگر یہ حالت آئندہ اسی طرح جاری رہی تو خواص کو چھوڑ کر اندیشہ یہ ہے کہ عام طور پر
ان کی ملازمت محرری، چپراس گری، برقندازی، پٹرولی، اور چوکیداری پر محدود ہو جائیگی

Nizamuddin Khan M.B.B.S.

فصل دوم

مجوزہ علاجوں کی ناکامی

تعلیم

۱۸۵۷ء کے غدر میں مسلمانوں کی بربادی نے سرسید مرحوم کے دل پر بڑا گہرا اثر کیا۔ اس وقت سے وہ برابر مسلمانوں کی بہبودی کے ذرائع سوچتے رہے حتیٰ کہ انھوں نے یہ طے کیا کہ جدید علوم کی اعلیٰ تعلیم سے مسلمانوں کے جملہ قومی امراض کا ازالہ کیا جائے۔ اس کے لیے سرسید نے ۱۸۷۵ء میں مدرسۃ العلوم علیگڈھ اور ۱۸۸۶ء میں تعلیمی کانفرنس شروع کی۔ اور مدرسۃ العلوم کو یونیورسٹی کے درجہ پر پہونچانے کا منصوبہ قایم کیا۔ یہ تحریک ان کی زندگی میں اور کچھ عرصہ تک ان کے بعد بہت سرعت کے ساتھ ہندوستان میں پھیلی اور ایک حد تک کامیاب ہوئی۔ علی گڈھ پھر قومی تحریک کا مرکز ہو گیا۔ جو آواز یہاں سے اٹھتی تھی تمام اسلامی ہند سے اس پر لبیک کی صدائیں آتی تھیں۔ مگر بدقسمتی سے قوم کے خیال میں کچھ انتشار پیدا ہو گیا۔ قومی یونیورسٹی کا قیام ملتوی کر دیا گیا اور تعلیمی تحریک سرد پڑ گئی۔ دوسری قومیں جو پہلے سے تعلیم میں ترقی کر رہی تھیں، اس اثنا میں قومی احساس اور سرمایہ کی افزونی سے کہیں کی کہیں پہونچ گئیں۔ قومی یونیورسٹی کا خیال اول مسلمانوں کو پیدا ہوا اور اس کے لیے تیس لاکھ روپیہ جمع ہو گیا۔ مگر ہندوؤں کی فراست اور اولوالعزمی نے اس میں بھی پیشقدمی کی اور بنارس میں یونیورسٹی بنا کر کھڑی کر دی۔ سرسید نے اولاً سیلف ہیلپ یعنی اپنی ضرورت کے کام خود انجام دینے کے اصول پر علی گڈھ کالج کی بنیاد ڈالی۔ سرسید کی مثال سامنے رکھ کر بعض دردمند مسلمانوں نے قومی درسگاہوں کی بنا ڈالی۔ ان میں سے صرف چند قایم رہ سکیں۔ باقیماندہ درسگاہیں یا تو مردہ ہو گئیں یا سسک رہی ہیں

ذخیرہ ہے کہ اس کا مقابلہ دنیا کا کوئی مذہب نہیں کرسکتا۔ دینیات کا اتنا بڑا اور صحیح ذخیرہ موجود ہونے کے باوجود، مسلمانوں کا ایسے مذاہب کے پیرووں سے جن کی کتابوں کو وہ محرّف، ناقص اور باطل سمجھتے ہیں۔ تمدّن اور اخلاق کے اعتبار سے مسلّم طور پر پیچھے رہجانا، ایک حیرت انگیز امر ہے۔ اسلام سے بڑھکر کسی مذہب میں اشاعت کی قابلیت نہیں پائی گئی۔ مگر اب اس کام کے لیے مسلمان ہر طرح کوشش کرتے ہیں اور کوئی معتدبہ نتیجہ نہیں نکلتا۔ برخلاف اس کے ایسے مذاہب جو نسبتاً اوہام و تعصبات سے مملو ہیں کامیابی کے ساتھ اشاعت مذہب کا کام کر رہے ہیں۔

اشاعت تو بڑی بات ہے خود موروثی مسلمان، جگہ جگہ مفلسی کی وجہ سے دیگر مذاہب کا شکار بن رہے ہیں۔ سنہ [illegible]ء میں اخبار وطن میں ایک صاحب نے تحریر فرمایا تھا کہ ضلع نایاں میں پندرہ سولہ ہزار مسلمان مفلسی سے دین عیسوی میں منتقل ہوگئے۔ اسی طرح ہندوستان کی نو مسلم قومیں رفتہ رفتہ اسلام سے نکل کر اپنے پرانے مذاہب اختیار کرتی جاتی ہیں اور اسی قسم کے نے انتہا مختلف طریقوں سے مسلمان مسلسل کمزور ہو رہے ہیں۔ یورپ اور امریکہ کے پادری بڑے پیمانہ پر اپنے مذہب کی اشاعت ہندوستان اور دیگر ممالک میں کر رہے ہیں اور اس سے کچھ نہ کچھ مسلمانوں کی تعداد کو گھٹاتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ اسلام کے تنزل اور دیگر مذاہب کی ترقی کی کیا وجہ ہے؟ اگر یہ کہا جائے کہ مسلمانوں کا مروجہ مذہب ہندوؤں اور عیسائیوں کے دقیانوسی اور پُر اوہام مذاہب سے بھی زیادہ خراب ہوگیا تو ہم یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ باوجود ہر قسم کے تنزل کے مسلمان خالص ایک خدا کی پرستش کرتے ہیں دیگر اقوام کے مقابلہ میں وہ بدرجہا زیادہ عبادت کرتے ہیں۔ پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ وہ معاملات میں، اخلاق و عادات میں، قومی جمعیت میں بت پرست اقوام سے بھی کمتر ہیں۔ ان افسوسناک حالات سے ممکن ہے کہ بعض مسلمانوں کے دلوں میں اسلام کی صداقت اور اس کی حقانیت کی طرف سے شکوک پیدا ہوتے ہوں کہ باوجود ان تمام کوششوں کے جو مذہب اگر

زندہ کرنے میں کی جاتی ہیں، مسلمانوں میں نہ مذہبی بیداری پیدا ہوتی ہے اور نہ دنیوی حالت بہتر ہوتی ہے۔ مگر مذہب کی صداقت کا معیار دنیوی کامیابی کو قرار دینا درست نہیں معلوم ہوتا۔ کیونکہ اکثر نبی ایسے گزرے ہیں جنھیں اپنی زندگی میں دنیوی سلطنت و دولت حاصل نہیں ہوئی بلکہ بعض کو تو مذہبی اشاعت میں بھی کامیابی نہیں ہوئی۔ البتہ یہ شرف آنحضرت صلعم کو حاصل ہوا کہ آپ کو اپنی حیات میں دونوں جہان کی بادشاہی نصیب ہوئی مگر یہ کیا ضرور ہے کہ حضور سرور کائنات کے تیرہ سو سال بعد اب پھر مسلمانوں کو دونوں اعتبار سے وہی بات حاصل ہو جائے۔ خود آنحضرت صلعم کا ارشاد ہے۔

خَيْرُ الْقُرُونِ قَرْنِي ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ

یعنی یہ کہ بہترین زمانہ آپ کا تھا۔ اُس کے بعد جو آپ کے زمانہ کے متصل ہو، پھر جو اُس زمانہ سے متصل ہو۔

مذہبی اصلاح کی دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ اب کوئی نیا پیغمبر آئے مگر مسلمانوں کے عقیدہ کے مطابق اب کوئی نیا پیغمبر نہیں آسکتا اور اگر کسی کے نزدیک کوئی دوسرے درجہ کا نبی آسکتا ہے تو یہ ضرور نہیں کہ وہ مذہبی اصلاح کے ساتھ مسلمانوں کو دنیوی ترقی کے اُس پایہ پر پہونچا سکے جس پر آنحضرت صلعم نے یا صحابہ کرام نے پہونچایا تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ مذہب خدا اور بندے کے درمیان ایک واسطہ ہے اور اُسے دنیوی ترقی اور تنزل سے اتنا زیادہ تعلق نہیں ہے جتنا کہ مسلمان سمجھے ہوئے ہیں۔ یہ خدا کا انعام تھا کہ ابتدائے اسلام میں مسلمانوں کو دینی اور دنیوی دونوں نعمتیں ایک ساتھ حاصل ہوئیں مگر اب جب کہ سیکڑوں سال کے تجربہ سے یہ ثابت ہو رہا ہے کہ مروجہ مذہب میں کوئی ایسی تبدیلی ہمارے امکان سے باہر ہے کہ اس کے ذریعہ سے دنیوی ترقی حاصل ہو تو ہمیں اُن طریقوں کے اختیار کرنے پر کفایت کرنا چاہیے جن کے ذریعہ سے دوسری قومیں اس دنیا میں زندہ رہکر اپنے مروجہ مذاہب و عقائد کو ہر طرف پھیلا رہی ہیں۔ اگر ہم اپنی قوم میں اس وقت صحابہ کرام کے سے اخلاق پیدا کرنے سے قاصر ہیں تو کیا ہم یہ بھی نہیں کر سکتے کہ جیسا کچھ بھی ہمارا مذہب ہے اُسے حفاظت کے ساتھ

اپنی آئندہ نسلوں تک پہونچا دیں۔ دیگر اقوام نے اس دوران میں اپنے مذاہب میں اپنے
علم ادب میں نئی روح پھونک دی اور اسی دوران میں مسلمانوں کے اعلیٰ خاندانوں کی اولاد
قلمی کتابوں کے نسخے اور فرامین شاہی دوسری قوموں کے ہاتھوں بیچ رہی ہے۔ پس اگر ہم
اس پایہ کی کتابیں تصنیف نہیں کر سکتے تو کم سے کم اتنا ضرور کر سکتے ہیں کہ اپنے کو اس قابل
بنالیں کہ ہمیں تنگیٔ معاش کی وجہ سے، پرانے علمی ذخیروں کی کتب فروشی، قوم فروشی اور دین فروشی
نہ کرنی پڑے۔

غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ جب اسلام نازل ہوا تو اس کا بڑا مابہ الامتیاز یہ تھا کہ وہ
آخرت کی درستی کے ساتھ اس کے پیروؤں کو دنیا کی کشمکش کے لیئے تیار کرتا تھا۔ سچے اسلام کی
پیروی کا پہلا انعام مسلمانوں کو یہ ملا کہ وہ دنیا میں ذی اقتدار اور متمول ہوگئے۔ بعض لوگوں کا
قول ہے کہ آنحضرت صلعم اور صحابہ کرام غریبی پر فخر کرتے تھے مگر ان کی غریبی کا اندازہ حالی کے
اس شعر سے خوب ہوسکتا ہے

تن پہ تھا فاروق اعظم کے پھٹا کرتہ مگر
قوم کی خاطر پھری نیت نہ لیکر ملکِ جم

ان کی غریبی کے ساتھ ان کا ہر ہر قدم دولت اور سلطنت کی طرف بڑھتا تھا اور اس سے
قوم کی عظمت و ہیبت میں اضافہ ہوتا تھا۔ جو طریقے اس زمانہ میں روپیہ پیدا کرنے کے تھے وہ
اختیار کیئے جاتے تھے اور جب روپیہ آتا تھا تو وہ اشاعت اسلام کی مہموں کو بھیجنے میں صرف
کیا جاتا تھا۔ مجاہدین میں تقسیم کیا جاتا تھا، بیووں اور یتیموں کو دیا جاتا تھا اور یہ روپیہ کی ہر طرف
اس قدر افراط تھی کہ لوگ مدینہ منورہ کی گلیوں میں سونا جھولیوں میں بھر کر آوازیں لگاتے پھرتے
تھے اور کوئی لینے والا نہ ملتا تھا اب جبکہ مسلمان فاقوں سے بھوکے مر رہے ہیں۔ بعض لوگ
دولت کی مذمت کے وعظ بیان کرتے ہیں۔ مگر ہمارے نزدیک انہیں دولت کو بری طرح خرچ
کر ڈالنے کی مذمت کرنا چاہیئے نہ خود دولت کی۔ اگر دولت کا صحیح استعمال کیا جائے تو وہ خدا کی نعمت ہے

سلطنت کے مسلمان دولت کماتے تھے اور اس کا صحیح اور مفید استعمال کرتے تھے اس لیے انھوں نے مسلمانوں کو اس درجہ پر پہونچا دیا کہ تیرہ سو سال کے سخت حوادث کے بعد اب اُن کی تعداد دنیا میں چالیس کروڑ کے قریب ہے۔ اگر دولت کی مذمت اس بنا پر کی جاتی ہو کہ لوگ اس کا خراب استعمال کرتے ہیں تو جوانی کی عمر کی بھی مذمت کرنا چاہیے جس کے زور میں بعض لوگ دوسروں کو ہلاک کر ڈالتے ہیں یا عیاشی کرکے اپنے کو برباد کر لیتے ہیں۔ دولت اور جوانی دونوں خدا کے عطیے ہیں اور دونوں کو خدا کی راہ میں قوم اور مذہب کی بہبودی کے لیے صرف کرنا انسان کے امکان میں ہے۔ اب یہ اس کے اختیار میں ہے کہ انھیں عمدگی سے استعمال کرے یا بُری طرح استعمال کر کے گنہگار رہے

ظاہر ہے کہ اس وقت ہماری ہمسایہ اقوام کے لوگ اس ملک میں ہم سے بدرجہا زیادہ دولتمند ہیں۔ مگر کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ وہ ہم سے زیادہ اپنی دولت کو عیاشی میں صرف کرتے ہیں۔ نہیں بلکہ ان کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنی ذات پر کم سے کم خرچ کرتے ہیں۔ مدت العمر نہ اچھا کھاتے اور نہ اچھا پہنتے ہیں اور پس انداز روپیہ شارع عام پر کنوئیں بنانے، دھرم سالے تعمیر کرانے، رفاہ عام اور مذہب کے کام انجام دینے میں صرف کرتے ہیں۔ یہ صرف اس وجہ سے ہے کہ وہ جانتے ہیں کہ روپیہ کا کیا کرایہ ہے۔ اس کی کیا قیمت ہے۔ صحیح طریقہ پر استعمال کرنے میں اس کے کیا فائدے ہیں۔ اخبارات میں ہم ہر روز یورپ اور ہندوستان کے دولتمندوں کی فیاضیوں کے قصے پڑھتے ہیں مگر تب بھی ہمارے ذہن میں دولت کی خوبیاں نہیں آتیں۔ اس وقت میرے سامنے معارف کا ماہ فروری کا پرچہ ہے اس میں تحریر ہے کہ امریکہ کے ایک دولتمند مسٹر ہنری فرک نے حال میں چھتیس کروڑ روپیہ امریکہ کی یونیورسٹیوں اور تعلیم گاہوں میں تقسیم کرنے کے لیے دیدیا۔ راک فیلر نے ساڑھے دس کروڑ کے عطیہ سے طب کا انسٹیٹیوٹ قایم کر دیا۔ اسی طرح وہ کروڑوں روپیہ مذہبی کاموں کے لیے دیتے ہیں اُن کی دولت تمام دنیا میں اُن کے مذہب کی اشاعت میں عیسائیوں کی پرورش کرنے، اُن کے لیے یتیم خانے خیرات خانے، اسکول، قایم کرنے میں

صرف ہوتی ہے۔ ان تمام امور نے دیگر مذاہب میں قوت جاذبہ پیدا کر دی ہے۔ برخلاف اس کے ہمارے مذہب سے قوت جاذبہ مسلب ہو رہی ہے اور واقعات بتا رہے ہیں کہ وہ روز بروز زیادہ مسلب ہوتی جاتی ہے۔ پس کوئی امید نہیں کہ جن طریقوں سے ہم اپنے مذہب کو اپنی ترقی کا ذریعہ بنانا چاہتے ہیں اس میں ہمیں کامیابی حاصل ہو۔

اصلاح تمدن

قوم کی اصلاح کا ایک ذریعہ اصلاح تمدن ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ بد رسوم کو ترک کیا جائے۔ عمدہ خصائل اور پسندیدہ اخلاق و عادات اختیار کیے جائیں۔ کفایت شعارانہ زندگی بسر کی جائے۔ گزشتہ تیس چالیس سالوں میں مسلمانوں نے لکچروں اسپیچوں اور مضامین کے ذریعہ سے اپنی قوم کو ان امور کی تلقین کی اور اصلاح خیال کے لیے سب سے اول سرسید مرحوم نے تہذیب الاخلاق جاری کیا اس کے بند ہونے کے عرصہ کے بعد چند سال تک تعلیمی کانفرنس کے متعلق ایک شعبہ از نام "صیغہ اصلاح تمدن" قایم رہا جس کے ناظم خواجہ غلام الثقلین صاحب مرحوم تھے۔ صاحب موصوف نے اس شعبہ کو بڑی عمدگی سے چلایا اور اشاعت مقاصد کے لیے ایک پرچہ عصر جدید کے نام سے شایع کیا۔ یہ پرچہ بند ہو گیا۔ تاہم اخباروں، خطبوں اور تقریروں کے ذریعہ سے اس قسم کے اصلاحی خیالات کی اشاعت، مسلمان اپنی قوم میں کرتے رہتے ہیں۔ اس سلسلہ میں بڑا زور اس امر پر دیا جاتا ہے کہ مسلمان شادی غمی میں زیادہ صرف نہ کریں اور کفایت شعاری کے طریقے اختیار کریں۔ ان نصیحتوں کا اثر کچھ نہ کچھ ضرور ہوا ہے اور اکثر لوگوں نے شادی غمی میں صرف کرنا کم کر دیا ہے اور سادہ زندگی بسر کرنا اختیار کر لیا ہے تاہم مجموعی طور پر قوم کی مالی حالت بہتر نہیں ہوتی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ روز افزوں مفلسی سے از خود مسلمانوں میں سادہ زندگی پیدا ہو گئی اور شادیوں وغیرہ میں صرف کرنے کے لیے اب انھیں قرض ملنا بھی مشکل ہو گیا اور دوسری وجہ یہ ہے کہ جب تک کہ روپیہ بچا کر کسی نفع کے کام میں لگانے کا طریقہ معلوم نہ ہو، گھر میں رکھا ہوا روپیہ کسی نہ کسی طرح صرف ہو جاتا ہے اور آخرکار مصرف اور کفایت شعار دونوں ایک حالت میں ہو جاتے ہیں جس قوم کے نزدیک روپیہ ضروریات زندگی فراہم کرنے کا

آلہ ہی اور ہمیں کو یہ نہیں معلوم کہ کیسی اندازہ کیا ہوا ایک روپیہ اس زمانہ میں ایسے کاموں میں لگ سکتا ہی کہ اُس سے انسانی دولت میں اضافہ ہو۔ اور اضافہ شدہ دولت کا ایک حصہ اُس ایک روپیہ کے مالک کو ملتا رہے۔ ایسی ناواقف قوم کے افراد کو اس امر کی کیا رغبت ہو سکتی ہی کہ وہ ایک روپیہ بچا کر اُسے رکھنے کی تکلیف گوارا کریں۔ جب وہ بچا کر نہیں رکھتے تو اتفاقات اور حادثات انھیں قرض لینے پر مجبور کرتے ہیں۔ قرضہ بغیر روپیہ کا بازاری کرایہ دیے انھیں مل نہیں سکتا انجام کار قرضہ کی بلا میں گرفتار ہو کر برباد ہو جاتے ہیں۔

مسلمانوں کا یہ دعوے بالکل صحیح ہی کہ اُن کے اسلاف نے دنیا میں تمدّن قایم کیا مگر اُس سے زیادہ یہ صحیح ہی کہ اُن کے اخلاف نے تمدّن کو جڑ سے کھود کر پھینک دیا۔ اس کی ایک ادنیٰ مثال یہ ہی کہ اسپین کے مسلمانوں نے بحری تجارت کی حفاظت اور ترقی کے لیے بیمہ بحری ایجاد کیا تھا (ملاحظہ ہو ڈریپر کی کتاب "قوائے عقلی کی ترقی کی تاریخ") بیمہ بحری نے سمندر کی تجارت کو تمام خطروں سے محفوظ کر کے اُسے نہایت وسعت دی۔ اور اس زمانہ میں وہ دنیا کی تجارت کی روح ہی۔ اُسی سے انسانوں کی زندگی کا بیمہ کرانے اور آگ کا بیمہ کرانے کے طریقے نکلے جو ہزاروں اور لاکھوں خاندانوں، کارخانوں، اور تجارت گاہوں کو تباہی اور بربادی سے بچاتے ہیں۔ یہ مسلمانوں کے اسلاف کی ایجادیں تھیں جو ذہنی ترقی کی دوڑ میں سب سے آگے تھے مگر اب چونکہ اُن کے اخلاف ذہنی تنزل کے چکر میں آ رہے ہیں اس لیے ہر جائز چیز جو اُن کی سمجھ سے بالاتر ہی انھیں ناجائز نظر آتی ہی۔ مگر جائز چیزوں کو ناجائز قرار دینے کا لازمی نتیجہ یہ ہی کہ بقاء حیات کے لیے مجبوراً ناجائز طریقے اختیار کرنے پڑتے ہیں۔

اس وقت ہمارے سامنے صوبہ متحدہ کی گذشتہ مردم شماری کے کچھ اعداد ہیں جن میں ہر پیشہ کی تقسیم، قوم وار دکھائی گئی ہی۔ اس نقشہ میں ایک خانہ "گداگروں کسبیوں اور مجرموں وغیرہ کا ہی"۔ اس خانہ میں سب سے اوپر سیدوں کی تعداد درج ہی اور یہ دیکھ کر سکتہ کا عالم طاری ہوتا ہی کہ اس کام میں اُن کا اوسط جملہ اقوام ہند سے بہت زیادہ ہی حتیٰ کہ چماروں سے بھی

پانچ گونہ ہے۔ پس جس قوم میں گداگروں اور مجرموں کی کثرت ہو اُن کے اخلاق کیا عمدہ ہو سکتے
ہیں۔ چماروں کی نسبت ہماری نواح میں مشہور ہے کہ اُن میں سے اگر کوئی شخص بھیک مانگنے لگے
تو برادری سے خارج کر دیا جاتا ہے۔ مسلمانوں کے لیئے یہ عبرت خیز امر ہے۔ اُن کے واعظ ہر طرح سے
نیکی کی ترغیب دیتے ہیں مگر کچھ اثر نہیں ہوتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وعظوں کے علاوہ دیگر
تدابیر اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ مثلاً یہ کہ جرائم روکنے کی بہترین صورت یہ ہے کہ مصروفیت کے
سامان پیدا کیئے جائیں۔ معاش کے جائز طریقے اختیار کیے جائیں۔ کاروباری زندگی
پیدا کی جائے۔ چنانچہ مولانا حالی مرحوم نے اپنی ایک تحریر میں ظاہر کیا ہے کہ تجارت انسان میں
بہترین اخلاق پیدا کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت جو اقوام کاروباری اور تجارت پیشہ ہیں اُن کی
خوش معاملگی اور اخلاقی برتری خود مسلمان تسلیم کرتے ہیں۔ پس موجودہ حالات میں جبکہ مسلمانوں
میں کاروباری زندگی عنقا ہے اور وہ معاش سے پریشان ہیں اصلاح تمدن کی کوئی تحریک
اُن میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔

موجودہ مایوسانہ حالت

گزشتہ اوراق میں تمام وہ طریقے عرض کیے گئے جو مسلمانوں
کا تنزل روکنے کے لیے اختیار کیے جا رہے ہیں مگر کوئی بہتری
کی صورت نظر نہیں آتی۔ تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ تمام تحریکات کی جان قومی سرمایہ ہے ہماری قوم
سرمایہ سے معرا ہو رہی ہے۔ بیشک چند لوگ کہیں کہیں خوشحال نظر آتے ہیں مگر اور قوموں کے
دولتمندوں کی نسبت سے اُن کا وجود بمنزلہ عدم کے ہے۔ بڑی دقت یہ ہے کہ ہماری قوم میں جو
شخص ذرا بھی خوشحال ہے اُس کی مشکلات کی کوئی انتہا نہیں۔ ہر شخص کی نظر اُس کی دولت پر ہوتی
ہے۔ دوسری قوموں میں یتیموں اور بیواؤں کی دولت جو اُن کے مورث چھوڑتے ہیں محفوظ رہتی
ہے اس لیے کہ ہر شخص اُن میں مستغنی ہے۔ ہماری قوم میں عاقل و بالغ شخص کی دولت بھی ہر وقت خطرہ
میں ہے۔ قوم سمجھتی ہے کہ زر نقد صرف کروا لینے کی شے ہے اس لیے وہ جانتی ہے کہ دولتمند بھائی اپنا روپیہ
اپنے ضرورتمند عزیزوں میں کسی نہ کسی صورت میں تقسیم کر دیں۔ مسلمانوں کی اس خصوصیت کے لحاظ سے

معلوم ہوتا ہے کہ وہ روپیہ سے بالکل مستغنی ہیں مگر واقعہ یہ ہے کہ روپیہ کے بارہ میں بھائی کو بھائی پر باپ کو بیٹے پر، شوہر کو زوجہ پر، زوجہ کو شوہر پر، دوست کو دوست پر، ذرہ بھر اعتبار نہیں۔ جو جس کے ہاتھ پڑ جائے وہ اس کے لیے مثل شیر مادر کے ہے۔ دنیا میں بہت سی قومیں ڈھکر گری ہیں مگر جس بُری طرح مسلمانوں کی قوم گری ہے اُس کی مثال بمشکل مل سکے گی۔ گزشتہ سال اپریل کے مہینے میں علی گڈھ کے ایک جلسہ وعظ میں ایک بڑے جیّد عالم مسلمانوں کی حالت زار پر تقریر فرما رہے تھے۔ اثناء وعظ میں آپ نے نہایت غصہ میں فرمایا کہ یہودیوں کے لیے خداوند تعالیٰ نے ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَاءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ فرمایا تھا مگر اب یہ ارشاد خداوندی تمام مسلمانوں پر صادق آتا ہے۔ میں اس فقرہ کو سُن کر لرز گیا اس لیے کہ خود ہمارے علماء نے تسلیم کر لیا کہ ہم سے بڑھکر دنیا میں کوئی ذلیل و خوار نہیں۔ کیا ہم اس لیے ذلیل و خوار ہیں کہ ہم نے خدانخواستہ کلام خداوندی میں کوئی تحریف کی ہے؟ ہرگز نہیں۔ کیا ہم اس لیے ذلیل ہیں کہ ہم اپنے خالق کی عبادت نہیں کرتے؟ ہرگز نہیں۔ کیونکہ اس گئی گزری حالت میں بھی مسلمانوں سے بڑھکر کوئی قوم خداوند تعالیٰ کی عبادت نہیں کرتی۔ کیا ہم قرآن شریف کی تلاوت نہیں کرتے اور دینیات کی کتابیں نہیں پڑھتے؟ ہرگز نہیں۔ نہیں بلکہ ہم دعوے سے کہہ سکتے ہیں کہ ہم تمام دنیا کی قوموں سے زیادہ دینیات کی کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ہم اس قدر ذلیل ہیں؟ ہم اس لیے ذلیل و خوار ہیں کہ اسلام نے دنیا کو ہم جیسا نعمۃ کو بنا کر تمدن کی نعمت ہمیں عطا کی اور ہم نے کفران نعمت کیا۔

یہودیوں پر دنیا میں حد درجے کے مظالم ہوئے ہیں۔ وہ یورپ کے بعض ممالک سے نکالے گئے تب اُنھوں نے اسپین میں پناہ لی۔ اسپین میں جب مسلمانوں کی سلطنت کا خاتمہ ہوا تو وہاں سے بھی یہودیوں کو نکلنا پڑا۔ وہاں اُن کا قتل عام کیا گیا۔ بالآخر تین ماہ کے اندر چلے جانے کی اجازت دی گئی مگر سونا چاندی لے جانے کی اجازت نہ تھی۔ جانے سے قبل انھیں ڈاکوؤں نے لوٹا اور تاراج کر لیا۔ جب بچے بچائے یہودی پرتگال کی پناہ میں پہنچ گئے تو وہاں بھی

اُن کے مخالف عیسائیوں نے یہ حکم جاری کرادیا کہ بالغ یہودی شہر بدر کردیے جائیں اور چودہ برس سے کم کے بچے اُن سے چھین کر عیسائیوں کو سپرد کردیے جائیں۔ اس لیے مجبور ہوکر یہودی عورتوں نے اپنے بچوں کو کنوؤں میں پھینکدیا اور زندہ چیر کر مار ڈالا تاکہ وہ عیسائیوں کے ہاتھوں میں نہ پڑیں۔ جس جہاز میں وہ جانے والے تھے اُس کے پہونچنے میں اُن کے مخالفوں نے دیر کردی اس لیے وہ معہودہ وقت پر روانہ نہ ہوسکے۔ اس پر انھیں غلام کرلیا گیا۔

غرضکہ اسی قسم کے مظالم اُن پر دنیا میں تیرہ صدیوں تک ہوتے رہے۔ مگر کون کہہ سکتا ہے کہ اُنھوں نے بہ حیثیت قوم کے مسلمانوں کی طرح کبھی بھیک مانگی۔ پرانے کپڑے بیچ بیچ کر جو روپیہ وہ جمع کرلیتے تھے حکام وقت اُن سے چھین لیتے تھے۔ یہی حالت کم درجہ پر پارسیوں کی ہوئی کہ وہ ملک بدر کیے گئے مگر ان قوموں نے واقعی طور پر اس ارشاد نبوی پر کہ "تجارت کرو کیونکہ اس میں دس میں سے نو حصے رزق کے ہیں" عمل کیا اس لیے وہ تمام مصائب کو عزت و آبرو کے ساتھ جھیل گئے۔ وہ مسلسل زر کا کاروبار کرتے رہے حتیٰ کہ موجودہ امن کا زمانہ آیا اور اس سکون کے عہد میں وہ ترقی کرکے تمام بندرگاہوں، تجارت گاہوں اور منڈیوں پر چھاگئے اور حاوی ہوگئے حتیٰ کہ اُن کی نیے انتہا دولت کی وجہ سے یورپ کے لوگ اُن پر رشک کرتے ہیں اور اُنھیں "طلائی کھٹمل" سے تعبیر کرتے ہیں۔

مسلمان سمجھتے ہیں کہ اُن کی قوم نے دنیا میں کافی زمانہ تک سلطنت کرلی اب قدرتی طور پر اُن کے زوال کا وقت ہے۔ ہم بھی مانتے ہیں کہ اب اُن کی سلطنت کا وقت باقی نہیں رہا ہے۔ مگر سلطنت جانے کے یہ کب معنے ہیں کہ تمام قوم افلاس کے انتہائی درجہ پر پہونچ جائے۔ ہندوؤں کی سلطنت جب جاچکی تب بھی مسلمانوں کے زمانہ میں شاہی خزانوں تک کے عہدے اُن کے ہاتھوں میں رہے۔ تجارت اُن کے ہاتھوں میں رہی اور کوئی شخص نہیں کہہ سکتا کہ وہ کبھی اس درجہ مفلس اور دست نگر ہوئے۔ جیسا کہ اب مسلمان ہیں۔ یا یہ کہ کبھی کسی پرانی قوم کا اس قدر جلد ایسا بدتر حال ہوا جیسا کہ مسلمانوں کا ہورہا ہے۔

دنیا کا بہترین مذہب نبی آخر الزماں پر نازل ہوا جس کی نسبت ارشاد ہوا اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا۔ (اب ہم تمھارے دین کو تمھارے لیے کامل کر چکے اور ہم نے تم پر اپنا احسان پورا کر دیا اور تمھارے لیے دین اسلام کو پسند فرمایا) جب مسلمانوں کے عقیدہ کی رو سے اب کوئی نبی آنے والا نہیں ہے تو ایسے مذہب کو اس امر کا اہل ہونا چاہیے تھا کہ اس کے قانون پر چلنے والے قیامت تک ترقی کرتے اور پھلتے پھولتے نہ کہ صرف ہزار بارہ سو سال کے عرصہ میں بناسہ کی طرح بیٹھتے چلے جاتے۔ ان واقعات سے تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ نسل انسانی کی ہزاروں لاکھوں سال کی عمر میں سے خیر الامم کو صرف ایک ہزار سال کے حصہ ملا تھا اور تمدن و معاشرت، اور سائنس کی ترقی کے شروع ہوتے ہی اسلام کا دور ختم ہو گیا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ ہزاروں سال کے پرانے مذاہب کے پیرو، جدید تمدن کی تاب نہ لا کر مضمحل ہو جاتے مگر یہ کیسی الٹی بات ہے کہ دنیا کی سی اقوام زمانہ کے حسب حال ثابت ہو کر جوان بنتی چلی جاتی ہیں اور مسلمانوں کی نوخیز قوم روز بروز بوڑھی ہوتی اور اپنا ہر ہر قدم فنا اور عدم کی طرف بڑھاتی چلی جاتی ہے۔ حالانکہ یہ یقینی امر ہے کہ مسلمانوں کا مذہب اس کے ماننے والوں پر کسی قسم کی تکلیف مالایطاق اور ظلم کو روا نہیں رکھتا۔ دین اسلام کی نسبت صاف الفاظ میں ارشاد ہوا ہے اَلدِّیْنُ یُسْرٌ یعنی دین میں آسانی ہے۔

اس میں کہیں حکم ہوتا ہے وَمَا جَعَلَ عَلَیْکُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ (اور دین کے بارے میں تم پر کسی طرح کی سختی نہیں کی)

اور کہیں ارشاد ہوتا ہے وَلَا نُکَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا وَلَدَیْنَا کِتٰبٌ یَّنْطِقُ بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ (اور ہم کسی شخص کی طاقت سے بڑھکر اس پر بوجھ نہیں ڈالتے اور ہمارے ہاں لوگوں کے اعمال کا رجسٹر ہے جو ہر ایک کا حال بتاتا ہے۔ وہ اطمینان رکھیں کہ کسی پر زیادتی نہ ہوگی۔)

ان تمام احکام سے بڑھکر ارشاد ہے فَمَنِ اضْطُرَّ غَیْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَیْهِ (جو لاچار و مجبور ہو جائے اور عدول حکمی کرنے والا اور حد سے بڑھ جانے والا نہ ہو تو اس پر گناہ نہیں ہے) پس قرآن شریف

کے ان صریح الفاظ موجود ہوتے ہوئے اگر کوئی قوم دیدہ و دانستہ مذہب کا نام لیکر فنا ہو رہی ہو تو یہ قصور اُس قوم کا ہو نہ کہ اس مذہب کے قانون کا۔

Niza[illegible] M. B. B. S. J[illegible]

اگر مذہبی قانون کا قصور ہوتا تو اُس کا اثر سب سے زیادہ اس ابتدائی زمانہ میں محسوس ہوتا جبکہ مذہب پر کامل عملدرآمد ہوتا تھا۔ اُس زمانہ کی دولت کے حالات سے اسلامی تاریخ کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔ البتہ انھیں مسلمانوں کے اخلاف کی حالت یہ ہی کہ زمیندار، دوکاندار، کاریگر اور مزدور، ضعیف مرد اور پردہ دار عورتیں گاڑیوں پر چڑھ چڑھکر اور ڈولیوں میں سوار ہو ہوکر اور پیدل گھسٹ گھسٹ کر قرضہ کے لیے دربدر مارے پھرتے ہیں۔ قرض مانگنا بھیک مانگنے کی ابجد ہی۔ پس جب قرضہ ملنا بند ہوجاتا ہی اور مانگنے کی کافی عادت ہوجاتی ہی تو قدرتی طور بھیک کا نمبر آتا ہی۔ جو لوگ معاش سے تنگ ہوکر دربدر مانگتے پھرتے ہیں اُن کی تعداد تو ظاہر ہی مگر اُن شریف اور بیوہ عورتوں کی تعداد کیسے معلوم ہی جو باہر نہیں نکل سکتیں اور پردہ کے اندر گھل گھل کر مرجاتی ہیں۔ زمانہ سابق میں جب مسلمان متمول تھے تو غریب عورتوں اور نادار یتیموں کی خفیہ امداد کیا کرتے تھے مگر اب زیادہ تعداد خود مردوں کی ایسی ہی جو خفیہ امداد کی جستجو میں رہتی ہی۔ اس حالت کا کچھ پتہ روسار عظام جاگیرداران اور فرماں روایان ملک اور تجار کے دفاتر سے چل سکتا ہی جہاں قریبا ہر طبقہ کے مسلمانوں کی درخواستیں طلب امداد یا طلب قرضہ کے لیے آتی رہتی ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ ان درخواستوں کے بھیجنے والے سب کے سب اس درجہ کے ضرورتمند ہوں۔ بلکہ ضرورتمندوں کی تعداد قوم میں چونکہ زیادہ ہی۔ اس لیے کل قوم پر یہ اثر پڑ رہا ہی کہ خفیف ضرورتوں کے لیے کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانا ہماری سوسائٹی میں معیوب نہیں رہا حالانکہ ہمارے مذہب میں اس کے متعلق سخت وعید ہی۔ اصحاب رسول اللہ صلعم میں سے کسی کے متعلق روایت ہی کہ اگر ان سے گھوڑے کی سواری میں کبھی چابک گر جاتا تو خود گھوڑے سے اتر کر چابک اٹھاتے اور کسی راہگیر سے چابک کے لیے کہنا گوارا نہ کرتے۔

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

بعض اصحاب کا خیال ہو کہ مسلمانوں کے تنزّل کا اصلی سبب اُن کے مختلف مذہبی فرقوں کی باہمی کشمکش خانہ جنگی اور دیگر اقوام کے ساتھ لڑائی ہو۔

جو لوگ نظام قدرت سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ جب لڑنے والے میں لڑائی کے نتائج برداشت کرنے کی قوت ہوتی ہو تو لڑائی سے اُس کو بجائے نقصان کے نفع پہونچتا ہو چنانچہ قانون ارتقار کی روسے انسان جملہ ابتدائی منازل طے کرکے اس تمدن کے درجہ پر لڑائی کی بدولت پہونچا ہو۔ بیشک مسلمان ہمیشہ سے آپس میں لڑتے ہیں اور دوسروں سے بھی لڑتے ہیں۔ اسی طرح عیسائی بھی آپس میں مذہبی اور ملکی لڑائیاں لڑتے رہے ہیں۔ مگر اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ہر بڑی لڑائی ایسے انکشافات کی موجب ہوئی ہو کہ اُس نے دنیا کو صدیوں آگے بڑھا دیا۔ مسلمانوں کو بھی کبھی ان لڑائیوں نے آگے بڑھا یا تھا۔ مگر جب سے دنیا میں لڑائیوں کا انحصار سرمایہ اور دولت پر ہو گیا ہو مسلمان نہ صرف ہار رہے ہیں بلکہ صفحہ ہستی سے مٹے جا رہے ہیں۔ اور کوئی صورت اُن کے بچنے کی نظر نہیں آتی۔

بیشک وہ کسی زمانہ میں رویئن تن تھے مگر اب سرمایہ نہ رہنے سے اُن کے جسم شیشہ کے مانند ہو گئے ہیں کہ حوادث زمانہ کی ایک ٹھیس برداشت نہیں کر سکتے۔

سرمایہ پیدا کرنے اور بڑھانے سے احتراز کرنے کی وجہ سے اُن کی مثال بالکل ایسی ہو گئی ہو کہ بھیڑیوں کے ایک گلہ میں سے چند بھیڑیوں کے پنجے اور مُنہ باندھ دیے جائیں۔ اس کا نتیجہ بجز اس کے کیا ہو سکتا ہو کہ کھُلے مُنہ بھیڑیئے بندھے مُنہ بھیڑیوں کو پھاڑ کھائیں۔ یا اُن کی ایسی مثال ہو کہ کسی ملک میں عام طور پر نہ صرف جملہ آلات حرب رکھنے کی بلکہ اُن سے دوسروں کو قتل کرنے کی اجازت ہو۔ مگر اسی ملک میں بعض لوگ آلات حرب رکھنا اور اُنھیں استعمال کرنا اپنے اوپر حرام کر لیں۔ پس ایسے زاہدوں اور راہبوں کا جو انجام ہو سکتا ہو وہ مسلمانوں کا ہو رہا ہو کیونکہ اب دنیا میں بجز مسلمانوں کے کوئی قوم ایسی نہیں جو ہر قسم کے تجارتی اور غیر تجارتی سود کو مسلمانوں کی طرح ناجائز اور معیوب سمجھتی ہو۔

دنیا کی دیگر اقوام کے لیے زمین، محنت، اور سرمایہ، ذرائع معاش ہیں۔ وہ ان تینوں سے نہ صرف اپنے گھروں کو بلکہ دنیا کے غیر آباد مقامات کو گلزار بنا رہے ہیں۔ انھوں نے محنت اور سرمایہ سے تار، ریل، بحری اور ہوائی جہاز تیار کیے ہیں جن سے دنیا اُن کے لیے مثل ایک شہر کے چند محلوں کے ہو گئی ہے اور اُن کی راحت اور آسایش کا وسیلہ بن رہی ہے۔ اور مسلمانوں کی یہ حالت ہے کہ زمین، جو اُن کا تنہا ذریعہ معاش تھی، اُن کے پانوں کے نیچے سے نکلی چلی جا رہی ہے۔ اس سے اُن کی حالت ایک ایسے جوالائی کی مانند ہے جس کی گردن میں ایک رسّی پڑی ہے، اُس رسّی کے سہارے سے وہ ایک تختہ پر کھڑا ہوا اور وہ تختہ بھی اُس کے پانوں کے نیچے سے نکالا جا رہا ہو اور اس کا اُسے کچھ احساس نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی مثالیں قوم کے لیے فال بد سمجھی جائیں گی مگر یہ وہ واقعات ہیں جو ہر روز ہو رہے ہیں اور جن پر توجہ نہ دلانے کا نتیجہ قوم کے حق میں اور زیادہ مضر ہے۔

ان مثالوں سے جو غرض کی گئیں یہ نہ سمجھا جائے کہ دیگر اقوام ہمیں جان بوجھ کر فنا کر رہی ہیں۔ یہ سمجھنا بڑی ناشکری ہوئی۔ اس لیے کہ ہم بدیہی طور پر دیکھ رہے ہیں کہ جب ہمارے اوپر کوئی مصیبت اور امداد کا وقت ہوتا ہے تو ہماری ہمسایہ اقوام یا حکمران اقوام میں سے کوئی بھی ایسی نہیں جو ہمیں اخلاقی اور مالی امداد دینے میں پہلو تہی کرتی ہو۔

مگر قانون قدرت یہ ہے کہ اگر ہم خود اپنی خبر نہ لیں تو دنیا کی کوئی قوت ہمیں فنا ہونے سے نہیں بچا سکتی۔ بقول مولانا حالی رحمۃ اللہ علیہ کے

جیتے ہیں دنیا میں وہ کیڑے مکوڑوں کی طرح — جن کو بڑھنے کی تمنا اور نہ کچھ گھٹنے کا غم
جس طرح ہو رہا کا کیڑا خوش ہو اپنے حال میں — گو رہے جو حالت اسی میں سب گزر جائیں ایام
پر زمانہ کہہ رہا ہے یہ بآواز بلند — یا قدم آگے بڑھاؤ ورنہ لو راہ عدم
نے ترقی ملک میں جیسا ہو دشوار آجکل — وحشیوں کی موت ہے شائستہ قوموں کا عمل

پس شائستہ قوموں کے عمل کا لازمی نتیجہ وحشیوں کی موت ہے، اگر شائستہ قوموں کے

قتل ہونے سے مراد خونریزی اور بربادی نہ سمجھنی چاہیے بلکہ واقعی طور پر شائستہ قوموں کے عمل سے دنیا
کی آبادی اور رونق مقصود ہوتی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ آبادی اور رونق کرنے کی وجہ سے
کمزور مخلوق کو خودبخود نقصان پہونچ جائے جب انسان نے جنگلوں اور بنوں کو صاف کرکے آباد کیا تو
ہزاروں قسم کے حشرات الارض کا از خود خاتمہ ہوگیا جب تک اُن کمزور نسلوں کا وجود تھا تب تک ملک
میں آبادی اور رونق نہ ہوسکتی تھی۔

یہی کلیہ ایک حد تک کمزور انسانوں پر صادق آتا ہے جو بعض حالتوں میں ترقی کے مانع ہوتے
ہیں۔ مثلاً یہ کہ اس ملک میں بڑی شکایت یہ ہے کہ یہاں سود کی شرح بہت زیادہ ہے جو تجارت میں ترقی
نہیں ہونے دیتی۔

سود کی شرح ہمیشہ اُس ملک میں زیادہ ہوتی ہے جہاں روپیہ کم ہوتا ہے اور روپیہ لینے والے زیادہ
ہوتے ہیں۔ جس ملک میں آزادی سے سود کا لین دین ہوتا ہے وہاں روپیہ بڑھنے کے شوق میں لوگ
کفایت شعاری کرکے روپیہ پس انداز کرتے ہیں اور کثرت سے ملک کے ایسے کاموں میں لگاتے
ہیں جن سے ملک کی دولت بڑھتی ہے۔ دولت کی افزونی سے خودبخود سود کی شرح گھٹ جاتی ہے
ہندوستان میں مسلمان، جو آبادی کے چوتھائی حصہ کے قریب ہیں کفایت شعار نہیں ہیں۔ اور
نہ صرف یہ کہ وہ پس انداز نہیں کرتے بلکہ اپنی ذاتی ضرورتوں کے لیے روپیہ قرض لینے کے حد درجہ
خواہشمند رہتے ہیں۔ اس کی وجہ سے سود کی شرح ملک میں بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ شرح سود
بڑھنے کے علاوہ ملک کا اصلی نقصان یہ ہے کہ جو روپیہ دوسری قومیں کفایت شعاری سے پیدا
کرتی ہیں وہ قرضہ کی صورت میں مسلمانوں کے ہاتھوں میں آکر فضول کاموں میں صرف ہوجاتا ہے
اور ایسے کارخانوں میں نہیں صرف ہوتا جس سے ملک کی حقیقی دولت بڑھے۔

• کاش اگر مسلمان بھی زر کے کاروبار میں شریک ہوکر ملک کی دولت میں اپنی مردم شماری
کی نسبت سے اضافہ کرتے تو یہاں کی صنعت و حرفت و تجارت میں کس قدر ترقی ہوتی۔ مگر بجائے
مدد ہونے کے اُن کا وجود ملک کی ترقی کا مانع ہے پس اگر ملک کی ترقی کی پرزور دوڑ میں مسلمان یہ چاہیں تو

یہ مسلمانوں کا قصور ہوگا نہ کہ دیگر اقوام کا۔

گزشتہ اوراق میں مسلمانوں کی پستی ہندوستان کے دیگر اقوام کے مقابلہ میں دکھائی گئی ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ اس وقت دنیا میں جو قومیں ترقی کر رہی ہیں اُن کی نسبت سے خود اقوام ہند نہایت پستی کی حالت میں ہیں۔ ممالک یورپ اور امریکہ میں علم و دولت کی جو افزایش ہے اس کا تصور اس ملک میں نہیں ہوسکتا۔ البتہ وہاں کی عام حالت کا کچھ اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ وہاں کے مسکین و محتاج اور مریض ایسے مکلف اور ستھرے خیرات خانوں اور ہسپتالوں میں اپنی زندگی کے آخری دن گزارتے ہیں جو یہاں کے امرا کو نصیب نہیں ہوتے اور [illegible] اربوں روپیہ غربا کی مصیبت رفع کرنے میں صرف کردیا جاتا ہے۔ اندھوں اور بہروں اور گونگوں کی تعلیم کے لیے لاکھوں روپے کی لاگت کی عمارتیں بنی کھڑی ہیں۔ ایک طرف تو غربا کے لیے یہ آسائشیں اور تکلفات ہیں اور دوسری طرف نوابوں اور شاہی خاندانوں کے نوجوان دنیا کو گلزار بنانے کے شوق میں سخت سے سخت گرم ممالک میں جاکر جنگلوں کو صاف کرتے ہیں۔ بیابانوں میں نہریں اور ریلیں نکالتے ہیں ہوائی جہازوں میں چڑھ کر قطبین میں جاتے اور تحقیقات کے شوق میں اپنی جانیں خطرے میں ڈالتے ہیں۔ ہمارے ملک میں اکثر ضلعے ایسے ہوں گے جہاں کسی شخص کے پاس سواری کی موٹر کار نہیں۔ امریکہ کی نسبت سنا گیا ہے کہ وہاں موٹروں کی اس قدر کثرت ہے کہ بحساب اوسط ہر ڈھائی آدمیوں کے حصے میں ایک موٹر کار آتی ہے۔ ریلیں، موٹر کاریں، ہوائی جہاز، تار، برقی رو۔ یہ سامان محض تفریح اور لطف کے نہیں ہیں بلکہ ان کے ذریعہ سے تھوڑے وقت میں زیادہ سے زیادہ کام انجام پاتے ہیں اور ان کا مجموعی اثر ان ملکوں کی تمدنی ترقی پر پڑتا ہے۔ پس ان اعلیٰ پیمانوں سے ہندوستان ابھی ترقی کی ابجد میں ہے۔ اس حساب سے مسلمانوں کا پتا بھی نہیں ملتا حالانکہ اپنی تعداد بھی ہندوستان میں سات کروڑ اور دنیا میں بیس کروڑ ہونے کے اعتبار سے دنیا میں ان کا تیسرا نمبر ہے۔ بیشک یہ وہ کسی زمانہ میں جملہ اقوام سے ہر طرح پر آگے تھے مگر افسوس کہ اب یہ وہ کسی گنتی میں نہیں ہیں۔ یہ قوم کس گنتی میں ہے وہ [illegible] کے زوال پر کہ وہ کثرت سے اپنی [illegible] سارا جہان۔

جسمانی قوت کے زور میں مسلمانوں نے مدت تک مال کی کوئی حقیقت نہیں سمجھی۔ مگر اب ہر طرف سے وہ گھر گئے ہیں تمام ترقی کے راستے انہیں اپنے لیے بند نظر آتے ہیں اور پریشانی اور سراسیمگی میں وہ اپنے جلسوں اور مجمعوں میں خداوند تعالیٰ کی بارگاہ میں وہ عجیب و غریب دعائیں کرتے ہیں۔ مگر ان کی عاجزانہ دعاؤں میں جو مختلف جلسوں میں مختلف الفاظ میں خداوند تعالیٰ کی بارگاہ میں کی جاتی ہیں، انانیت اور خود پسندی کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔ مثلاً یہ کہ ایک موقع پر خداوند تعالیٰ سے خطاب کرتے ہوئے کہا گیا کہ یا الٰہی تو ہمیں تباہ مت کر۔ ہم نے تیری عبادت کی ہے اور تیرا نام فاقہ کی حالت میں لیا ہے۔ ہم غریب ہیں، جاہل ہیں اور اُن تمام خوبیوں کو کھو چکے جن سے ہمارے بزرگ دنیا میں چمکے تھے مگر اب بھی ہم تیرے عبادت گزار ہیں۔ دوسرے موقع پر دعا میں کہا گیا کہ یا الٰہی! ہم مسلمان برباد ہو رہے ہیں، تباہ ہو رہے ہیں، فنا ہو رہے ہیں مگر معلوم رہے کہ ہمارے فنا ہونے کے بعد تیرا نام لینے والا، تیری سچی پرستش کرنے والا، تیری خالص توحید ماننے والا، روئے زمین پر باقی نہ رہے گا۔

اس قسم کی دعاؤں سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان چاہتے ہیں کہ دنیا کو آباد کرنے، زمین کو گلزار بنانے مخلوق کو خوشحال بنانے میں کوئی حصہ نہ لیں، اپنی آئندہ نسلوں کو دنیا میں رہنے کے قابل بنانے میں کوئی تکلیف نہ اٹھائیں، معاش پیدا کرنے کی کوئی تدبیر نہ کریں۔ اپنے بزرگوں کی تمام خوبیوں کو جن سے وہ دنیا میں چمکے تھے کھو کر اُن کے ترکہ پر آپس میں ایک ایک بسوہ کے لیے خوب مقدمہ بازی اور جوتی پیزار کریں، ہاتھ پاؤں کی محنت سے بازاروں اور منڈیوں میں روپیہ پیدا کرنا معیوب سمجھیں مگر یتیموں، بیٹیوں، اور مذہبی اوقاف کے مال میں تصرف کو اور بدمعاملگی اور ناد ہندی کو روا رکھیں اور اس قسم کے طریقوں سے دنیا کے اجڑنے کے سامان کرتے رہیں اور نعوذ باللہ خداوند تعالیٰ پر اپنی حقیر عبادت کا احسان جتا کر اور اس کا لالچ دے کر اُس سے دنیا میں رہنے کا استمراری پٹہ لکھا لیں۔ یہ تو شخصی سلطنت کا کوئی گیا گزرا بادشاہ بھی گوارا نہ کرے گا کہ کسی کی چاپلوسی اور خوشامد میں آکر اپنی سلطنت ایسے لوگوں کے

ہاتھوں میں دیدے جو آباد کرنا نہیں بلکہ اجاڑنا چاہتے ہیں۔ خداوند تعالیٰ قرآن شریف میں ارشاد فرماتا ہے:۔

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ (آخر سورۂ مائدہ)

یعنی "ہم زبور میں نصیحت کے بعد یہ بات لکھ چکے ہیں کہ ہمارے نیک بندے زمین کی سلطنت کے وارث ہوں گے" اس حکم کی رو سے جب تک مسلمان نیک بندے رہے تب تک اُن کے پاس سلطنت رہی۔ جب وہ نیک نہیں رہے اُن سے چھین کر دوسروں کو دیدی گئی۔

یہ وہ بارگاہ ہے جس میں نہ خوشامد چلتی ہے نہ چاپلوسی کو کوئی دخل ہے۔ وہاں بجز اس کے قانون پر چلنے اور اُس کے احکام کی بجا آوری کے کسی چیز کا اثر نہیں ہے۔

فصل سوم

تدابیر

افلاس کی دلدل سے نکلنا

مسلمانوں نے اپنی ترقی کے لیے جتنے طریقے اُن کے امکان میں تھے اختیار کیے جن کی بدولت اُن میں مدتوں تعلیم کے لیے شور و شغب رہا مذہب کی اشاعت کا جوش رہا، اصلاح تمدن کا چرچا رہا۔ مگر ہر کام سرمایہ کی قلت سے ناکام رہا جس وقت مسلمانوں کو اپنی زبوں حالت کا احساس ہوا اُس وقت کہا جاتا تھا کہ وہ ترقی کی دوڑ میں دیگر اقوام سے پیچھے ہیں۔ اُس وقت یہ کہنا ایک حد تک درست تھا کیونکہ اُن کا قدم کچھ نہ کچھ آگے بڑھتا تھا اگرچہ دیگر اقوام سے پیچھے رہتا تھا۔ مگر اب جبکہ اُن کی ترقی کے

سب کام رکے پڑے ہیں اُن کی نسبت بجز اس کے کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ دلدل میں پھنسے پڑے ہیں اور اس حالت میں ہیں کہ نہ صرف دنیا کی شائستہ اور مہذب بلکہ ادنیٰ ترین اقوام، جن میں حرکت کرنے کی کچھ بھی قوت ہے، اُن سے آگے بڑھی جا رہی ہیں۔ اس دلدل سے نکلنے کے لیے مختلف طریقے اختیار کیے جا رہے ہیں جن کی تفصیل گزشتہ اوراق میں کی گئی ہے۔ مگر چونکہ فی الحال اُن کے اُبھرنے کے کوئی آثار معلوم نہیں ہوتے اس لیے ضرورت ہے کہ اُن طریقوں پر نظرِ ثانی کی جائے اور آئندہ کے لیے موثر تدابیر اختیار کی جائیں۔

موجودہ حالت میں ہماری قوم میں تین خیال کے اصحاب پائے جاتے ہیں۔ اوّل وہ جو اسلام اور افلاس کو مرادف اور ہم معنی سمجھتے ہیں۔ اُن کے نزدیک اسلام غریبی سے شروع ہوا اور غریبی پر ختم ہوگا اس لیے موجودہ حالت سے نکلنے کی کوشش کرنا بے سود ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ دولت کی کثرت مادیت کو بڑھاتی اور روحانیت کو گھٹاتی ہے حالانکہ دولت اور مادیت کے قدر دانوں کی کیفیت یہ ہے کہ وہ مصیبت میں ایک دوسرے کے کام آتے ہیں، ڈوبتے ہوئے انسانوں کو بچانے کیلئے دریاؤں میں کود پڑتے ہیں، لگی ہوئی آگ بجھانے کے لیے اپنی زندگی خطرہ میں ڈال دیتے ہیں، بعض ایسے ہیں جو باوجود متمول ہونے کے جذامیوں کی خدمت کرتے کرتے خود مجذوم ہو جاتے ہیں، اپنی گاڑھی کمائی کے روپیہ سے غریبوں اور مریضوں کے لیے محتاج خانے اور ہسپتال، اندھوں گونگوں اور اپاہجوں کے لیے اُن کے حسب حال درسگاہیں اور کارخانے بناتے ہیں مگر باوجود ہر قسم کے ایثار اور حقیقی نفس کشی کے روحانیت سے معرا سمجھے جاتے ہیں۔ برخلاف اس کے جو لوگ دوسروں کے دست نگر ہیں معتقدات کے خفیف اختلافات پر لڑ لڑ کر تمام قوم میں ہیجان پیدا کرتے ہیں، مصیبت زدوں غریبوں بیکسوں اور مریضوں کی خدمت کی نہ صلاحیت رکھتے ہیں اور نہ اسے ضروری سمجھتے ہیں، وہ اپنی روحانیت اور مذہبیت پر فخر کر کے اہل دول اور اہل سائنس کی جنھوں نے انسان کی راحت کے ہزاروں قسم کے سامان فراہم کیے ہیں، تحقیر کرتے ہیں۔ اس خیال کے اصحاب مسلمانوں کو افلاس کی دلدل سے نکالنے پر کیسے آمادہ ہو سکتے ہیں۔

دوسرے وہ اصحاب ہیں جن کا خیال یہ ہے کہ مسلمان دنیوی ترقی بجنسہ اُن طریقوں سے کریں گے جیسے کہ انھوں نے ابتدا میں کی تھی۔ اُن کا منصوبہ یہ ہے کہ اول مسلمانوں میں سلف کے مسلمانوں کی سی مذہبیت اور صداقت پیدا کی جائے اور اُن کے اخلاق درست کیے جائیں تب وہ خود بخود دنیوی معراج کمال پر پہونچ جائیں گے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ مذہبی جوش پیدا ہونے پر وہ مثل آنحضرت صلعم اور صحابہ کرام کے دنیا کو مغلوب کر لینگے۔ مگر سوال یہ ہے کہ آیا وہ اب صحابہ کرام کا سا ایثار اور مذہبی جوش اور مذہبی حمیت پیدا کر سکتے ہیں اور اگر کر سکتے ہیں تو آیا بجنسہ اُن طریقوں کے اختیار کرنے سے جو پہلے زمانہ میں استعمال ہوتے تھے، وہ دنیا کو مغلوب کر سکتے ہیں۔

بقول آنریبل جسٹس عبدالرحیم صاحب کے، اس کی مثال بالکل ایسی ہوگی کہ اس زمانہ میں انگلستان بحری لڑائی میں بادبانی جہازوں کا بیڑہ استعمال کر کے کامیابی حاصل کرنے کی کوشش کرے جس سے اُن کے زبردست امیر البحر نیلسن نے ٹریفالگر کی مشہور لڑائی جیتی تھی۔

واقعہ یہ ہے کہ زمانہائے سابق میں لڑائی کے سامان کے اعتبار سے کل دنیا قریبًا یکساں حالت میں تھی اور کم و بیش ایک حیثیت کے آلات حرب استعمال کرتی تھی۔ اور جسمانی قوت اور حوصلہ کے تھوڑے بہت فرق سے ایک قوم دوسری پر غلبہ پاکر مغلوب قوم کی جان و مال کی مالک ہو جاتی تھی اور یہی اس زمانہ میں حصول دولت اور سلطنت کا ذریعہ تھا۔ برخلاف اس کے اس زمانہ میں، علاوہ بے شمار آلات حرب اور ہوائی جہازوں کی فراہمی کے دولتمند قومیں اپنا فاضل سرمایہ کروڑوں کی تعداد میں سالہا سال تک اُن ممالک میں بغیر کسی بدل یا معاوضہ کے پھینکتی رہتی ہیں جن پر وہ قبضہ کرنا چاہتی ہیں اور قبضہ کرنے کے بعد اُن میں اربوں روپیہ لگا کر اُس سے نفع کماتی ہیں اور یہی ملکوں کو حاصل کرنے اور انھیں اپنے قبض و تصرف میں رکھنے کے ذرائع ہیں پس جو مسلمان ان ذرائع کو نظر انداز کر کے اور سلف صالحین کا سا محض مذہبی جوش اپنی قوم میں پیدا کر کے اُسے دنیوی شوکت اور اقتدار کے حصول کا ذریعہ بنانا چاہتے ہیں وہ سمجھ رکھیں کہ ابن رشد کے لو مبروکی یہ ترکِ تنافس بیشک مسلمانوں کو پیچھے ہٹاتے ہٹاتے صحابہ تک پہونچ جائے گا مشورہ دنیا بظاہر نہایت

خوشگوار معلوم ہوتا ہے مگر بقول سر سید مرحوم کے "صحابہ کرام اور رسول خدا صلعم تک جا ملنا نہایت دشوار بلکہ ناممکن ہے۔ ہمیں خوف ہے کہ وہ پیچھے ہٹتے ہٹتے کہیں گڈھے میں نہ جا پڑیں لا تکلم علی شفا حفرۃ گڈھے میں گر جانے کا اندیشہ عرصہ ہوا کہ سرسید نے ظاہر کیا تھا مگر اب واقعی طور پر مسلمان ایک دلدل میں پھنس گئے ہیں جس میں سے وہ ہاتھ پاؤں مار کر بدن کا زور لگا کر نکلنا چاہتے ہیں مگر ان طریقوں سے وہ دلدل میں اور زیادہ پھنستے جاتے ہیں۔

تیسرے وہ اصحاب ہیں جو گزشتہ چالیس سال سے قوم کو یہ مشورہ دے رہے ہیں کہ اپنی مذہبی اور قومی خصوصیات کو پیش نظر رکھکر اس زمانہ کے وہ علوم و فنون سکھائے جائیں جن سے دوسری قومیں دنیوی ترقی کر رہی ہیں۔ جیسا کہ گزشتہ اوراق میں مذکور ہوا یہ طریقہ کچھ عرصہ تک اختیار کیا گیا لیکن اس کام کیلئے مسلسل کوشش اور استقلال اور سکون کی ضرورت تھی مگر بعض اشتعال انگیز تحریکات کی وجہ سے جو قومی ترقی کا ذریعہ سمجھی گئی تھیں مسلسل کوشش اور استقلال اور سکون میں فرق آگیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ نے قاعدہ اور بے اصول کشمکش کرنے سے مسلمان اور زیادہ تنزل کی دلدل میں اتر گئے اور اترے چلے جا رہے ہیں۔ دلدل سے نکلنے کی بہترین تدبیر یہ ہوتی ہے کہ انسان جہاں کھڑا ہو وہیں آہستگی سے لیٹ جائے اور لیٹے لیٹے دلدل سے باہر ہو جائے۔ بیشک کسی جوانمرد اور بہادر آدمی کے لیے جو بڑے بڑے میدان جیت چکا ہو۔ کسی مشکل کے وقت لیٹ جانے میں ذلت ہے۔ مگر اب اس کے سوا کوئی چارہ باقی نہیں رہا۔ اس حالت میں ہاتھ پاؤں مارنے چیخنے چلانے اور جھنجھلانے کا سوا اس کے کیا نتیجہ ہو سکتا ہے کہ دلدل میں اترنے کی رفتار اور زیادہ تیز ہو جائے۔ یہ دلدل افلاس اور تنگدستی کی دلدل ہے اور اس سے نکلنے کے لیے مسلمانوں کو تمام وہ طریقے اختیار کرنے پڑیں گے جن کو اب تک وہ نہایت حقیر اور ذلیل سمجھتے تھے۔ اگر وہ ایسا نہ کرینگے تو مسلسل زمین میں اترتے اترتے خدانخواستہ صفحہ ہستی سے مٹ جائیں گے۔

اب تک جو ان کے طریقے ہیں اگر غور سے دیکھا جائے تو وہ بھی مضر نہیں بس جان بچانے کی غرض سے

اُنھیں اپنے معمولات بدلنے میں کچھ تامل نہ کرنا چاہیے۔ ادنیٰ درجے کی نوکری اور امیدواری کا نگری
اور مزدوری، چھوٹی زمینداری اور کاشتکاری، پھر اُنھیں قایم رکھنے کے لیے عدالتوں کی حاضری
اور عدالتوں کی حاضری دیتے دیتے دوسروں کے مقدمات کی پیروی اور گواہی مقدمات کی
کامیابی اور کشایش رزق کے لیے بزرگوں اور مزاروں کی حاضری، مہوسی اور کیمیاگری، ان
سب کاموں کے ساتھ فضول خرچی اور عیاشی، جب کھانے کو نہ رہے تو قرضداری اور
ڈگریداروں کے خوف سے روپوشی، قرضہ لیتے لیتے جب مانگنے کی عادت ہو جائے تو مختلف
صورتوں میں گداگری، یہ سب ایسے طریقے ہیں جو بجز مسلمانوں کے کسی کے نزدیک معزز نہیں
لیکن اگر اُنھیں دنیا میں رہنا ہی تو یہ معزز پیشے چھوڑ کر دکانداری اور خوانچہ فروشی، صرافی اور مہاجنی
کفایت شعاری اور کنجوسی، اختیار کرنی پڑیگی۔ بیشک وہ بعض دوسرے طریقوں سے ان ذلیل
کاموں کے مقابلے میں زیادہ روپیہ پیدا کر سکتے ہیں۔ مگر دولت زیادہ کمانے سے نہیں بلکہ
زیادہ بچانے سے پیدا ہوتی ہی اور ان پیشوں میں بڑی خوبی یہی ہی کہ اُن سے روپیہ بچانے
اور کفایت شعاری کرنے کی تربیت ہوتی ہی۔ یہ درست ہی کہ اس گئی گزری حالت میں بھی کثرت
سے مسلمان ایسے ہیں جنھیں اپنی ذات کے لیے زر کا کاروبار کرنے یا اس قسم کے ذلیل پیشے اختیار
کرنے کی ضرورت نہیں ہی لیکن اگر اُن کے دل میں یہ اُمنگ موجود ہی کہ اُن کی نسلیں اس دنیا میں
باقی اور قایم رہیں تو اُنھیں اپنے قومی فرض کو محسوس کر کے ایسے کام اختیار کرنے چاہییں
جن سے مسلمان سرمایہ کی غلامی سے نکلیں۔ پہلے زمانہ میں جو لوگ لڑائیوں میں گرفتار ہو کر
غلام بنا لیے جاتے تھے، اُنھیں تلوار سے لڑ کر یا نقد روپیہ دیکر چھوڑایا جاتا تھا مگر سرمایہ کی غلامی
ایک ایسی بلا ہی کہ اُس سے لڑائی یا دنیا کی کوئی اور قوت بجز سرمایہ کے نجات نہیں دلا سکتی۔
پس وہ اصحاب جو مسلمانوں کو اس غلامی سے نجات دلانا چاہتے ہیں کمر بستہ ہو کر اس کام کے
لیے کھڑے ہو جائیں۔ وہ کام یہ ہی کہ قوم میں سرمایہ پیدا کرنے کی قابلیت پیدا کریں جو بغیر
تجارتی سود کا لین دین اختیار کیے ہرگز پیدا نہیں ہو سکتی۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب نے اس

ضرورت کو محسوس کر کے نہ صرف تجارتی سود بلکہ اس ملک میں ہر قسم کے سود کے جواز کا فتوے عرصہ ہوا کہ دیا تھا اُس کے بعد متعدد رسالے اُس کے جواز میں شایع ہوئے مگر ہنوز روز اوّل ہے یعنی جب تک کہ اس تجویز کی اشاعت کا کام باضابطہ نہ کیا جاوے گا مسلمانوں میں سود کا رواج ہونا مشکل ہے۔ صدیوں کے شکوک کو رفع کرنا چند سال کا کام نہیں ہے۔ اس لیے بعض اصحاب کو ترویج سود اور دوسرے تجارتی کاموں کی ضرورت کا احساس ہو وہ عام طور پر مسلمانوں سے اس بارہ میں گفتگو کریں اور اس کے لیے ذیل کے طریقے یا اُن کے نزدیک جو اور طریقے مناسب ہوں اختیار کر لیں۔

ترویج سود کی انجمنیں قایم کرنا

مسلمان اپنے اپنے مقامات میں ترویج سود کی انجمنیں قایم کریں۔ جواز سود کے لٹریچر کو جو اب موجود ہے اور جس کی تفصیل اس رسالے کے آخر میں کی گئی ہے فراہم کر کے مسلمانوں کو دکھائیں اور اخبارات دیکر اس مسئلہ پر مضامین لکھائیں اور انھیں شایع کریں۔ جو شخص اپنی آمدنی کا مثلاً کم سے کم دسواں حصہ پس انداز کر کے کسی بنک میں کسی کارخانے کے حصوں یا جائداد کی خریداری میں یا زر کے کاروبار میں لگائے وہ اس انجمن کا ممبر ہو سکے۔ آمدنی کا دسواں حصہ محض مثال کے طور پر لکھا گیا ہے۔ ہر مقام کے لوگ جو حصہ اپنے لیے قابل عمل سمجھیں مقرر کریں۔ اس انجمن میں کاریگروں کو خاص طور پر شریک کیا جائے جو خوب کماتے ہیں مگر فضول خرچی اور نشہ بازی کی وجہ سے برباد حقیقی معنوں میں سرمایہ داروں کے غلام بنے ہوئے ہیں۔ اس تجویز پر عملدرآمد کرنے میں بڑی دقت یہ ہوگی کہ کثرت مسلمان پہلے سے مقروض ہیں اور جب تک کہ وہ قرضہ سے سبکدوش نہ ہوں روپیہ اندوختہ کرنے میں تامل کرینگے مگر قرضہ سے سبکدوش ہونے کی صرف یہی صورت ہے کہ باوجود قرضداری کے پس انداز کرنے کی عادت ڈالی جائے۔ اس طرح پر کہ تمام مقروض اشخاص حصہ مقررہ مثلاً دس فی صدی میں سے پانچ فی صدی قرضہ میں دیں اور پانچ فی صدی پس انداز کر کے زر کے کاروبار میں لگائیں۔ بادی النظر میں یہ تجویز قابل عمل معلوم نہ ہوگی مگر قرضداری کے مرض کا ازالہ اور اس کا کارگر علاج اس سے بہتر کوئی نہیں

ہو سکتا۔

طلبا کو کفایت شعاری پر انعامات دینا

اسلامی مدارس کے مہتمم اُن طلبہ کو سالانہ انعام دیں جو سیونگ بنک میں اپنے جیب خرچ کا سب سے بڑا حصہ جمع کریں۔ سُنا گیا ہے کہ بعض اسکولوں میں طلبا کی مشترک سرمایہ کی کمپنیاں قایم ہو رہی ہیں۔ اِس قسم کی کمپنیاں اسلامیہ اسکولوں میں قایم کر کے طلبا کو عملی زندگی کے لیے تیار کیا جائے۔ جس قدر لڑکے مدارس میں پڑھتے ہیں اُنمیں بہت کم ایسے ہیں جو ملازمت کے اعلیٰ عہدے پاکر اطمینان کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ باقیماندہ کثیر تعداد ایسی ہوتی ہے۔ جو پوری یا ادھوری تعلیم پانے کے بعد پریشان زندگی بسر کرتی ہے شمس العلما مولوی محمد ذکاء اللہ صاحب مرحوم نے ایکبار فرمایا تھا کہ حقیقی خوشی اُس شخص کو حاصل نہیں ہوتی جو دس ہزار کمائے اور دس ہزار یا اس سے زیادہ خرچ کردے۔ بلکہ اُسے حاصل ہوتی ہے جو دس روپے کمائے نو روپے خرچ کرے اور ایک روپیہ پس انداز کرے۔ اس قسم کی عملی تعلیم بچوں کو گھروں میں اور طلبا کو مدرسوں میں دیکر اُنھیں نیوی کشمکش کے لیے پوری طرح تیار کیا جائے۔

مشترک سرمایہ کی کمپنیاں قایم کرنا

مشترک سرمایہ کی کمپنیاں اور زراعتی بنک اور کاریگروں کے بنک کھولنے کی کوشش کریں۔ ان کے قواعد ہر صوبہ کی گورنمنٹ کے صدر مقامات سے اور اکثر اضلاع کے صدر مقامات سے مل سکتے ہیں۔

بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ بنکوں کی حالت خطرہ سے خالی نہیں ہوتی۔ کیونکہ بعض وقت اُن کے دیوالے نکل جاتے ہیں۔ مگر یہ یقینی امر ہے کہ بینک بمقابلے گھروں کے اور اُن امانتداروں کے جن کے پاس مسلمان بعض وقت روپیہ رکھاتے ہیں بدرجہا زیادہ محفوظ ہیں اگر حادثات کا خیال کیا جائے تو ریل اموٹر کار اور اکثر تیز سواریاں اس قابل نہیں کہ اُنھیں استعمال کیا جائے مگر ان سواریوں کے بیشمار فوائد کے مقابلے میں قلیل الوقوع حادثات کی کوئی حقیقت نہیں اگر بینک ملکوں کی بربادی کا باعث ہوتے تو اُن ممالک کو جہاں بنکوں کی کثرت ہے۔ ہمارے ممالک سے

زیادہ برباد ہونا چاہیے تھا حالانکہ وہ بدرجہا زیادہ آباد ہیں۔ خلاصہ یہ کہ موجودہ زمانہ کے تمدّن کی بنیاد اس امر پر ہے کہ افراد کا پس انداز کیا ہوا ایک ایک پیسہ جمع ہو کر بنکوں کے ذریعہ سے کل ملک کو آباد کرنے کے کاموں میں لگے۔ اس طریقے نے اہل مغرب کے گھروں کو، گھروں نے جماعتوں کو، جماعتوں نے سلطنتوں کو آباد اور قایم کیا اور اسی طریقہ کے اختیار کرنے سے ہمارے اُجڑے ہوئے گھر اب پھر آباد ہو سکتے ہیں۔

زر کا کاروبار کرنا

جو مسلمان پہلے سے تجارت کرتے ہیں بالخصوص انھیں زر کا کاروبار اختیار کرنے کی ترغیب دیجائے ورنہ مسلمانوں میں جو کچھ تھوڑی بہت تجارت باقی ہے اُس کا قایم رہنا آئندہ زمانہ میں مشکل ہوگا۔ علاوہ اُن بے شمار فوائد کے جو مذکور ہوئے اس کا ایک بڑا ہی نفع یہ ہے کہ جس قوم میں زر کا کاروبار کرنے والے زیادہ ہوتے ہیں وہ وقت پر قوم کے تاجروں کو روپیہ دیکر اُن کی بہت کچھ مدد کر سکتے ہیں۔ برخلاف اس کے جس قوم میں زر کا کاروبار کرنے والے نہیں ہوتے۔ اُن میں روپیہ والوں کی بے اعتنائی سے بہت سے تاجر بگڑ جاتے ہیں۔ زمانہ سابق میں جن محکوم اور مغلوب قوموں نے زر کا کاروبار اختیار کیا انھیں حکمرانوں کے بد تر سے بد تر مظالم دنیا سے نیست و نابود نہ کر سکے۔ اور آج وہ راحت اور عزّت کی زندگی بسر کر رہی ہیں۔ اس زمانہ میں زر کا کاروبار نہ صرف مغلوب قوموں کی بقا کے لیے بلکہ حاکم اور محکوم غالب اور مغلوب سب کے لیے ناگزیر ہے اور بقول پروفیسر برنی کے "اصل یا سرمایہ بنی نوع انسان کے جسم کا خون حیات بلکہ روح حیات ہے"۔ پس قومی حیات باقی رکھنے کے لیے ہر فرد قوم کا فرض اوّلین ہے کہ سرمایہ کی فراہمی میں بقدر امکان ساعی ہو۔

زندگی کا بیمہ کرانا

متوسط الحال مسلمانوں کو آمادہ کیا جائے کہ وہ اپنے پسماندگان کیلیے اپنی زندگی کا بیمہ کرائیں۔ بعض ناواقف لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ بیمہ ایک قسم کا جوا ہے حالانکہ یہ درست نہیں۔ جوئے کا ایک بڑا ہی نقص یہ ہے کہ اُس میں مبتلا ہونے والے

اشخاص غیر یقینی زندگی بسر کرتے ہیں اور ہر وقت تباہی کے اندیشہ میں رہتے ہیں۔ برخلاف اس کے بیمہ کرنے والے اور بیمہ کرانے والے دونوں حد درجہ اطمینان اور سکون قلب کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ بیمہ کرنے والی اکثر کمپنیاں صدیوں سے قایم ہیں اور روز افزوں ترقی کرتی جاتی ہیں اور بیمہ کرانے والے اگر میعاد معینہ تک زندہ رہتے ہیں تو ضعیفی کے زمانہ میں انھیں ایک رقم ملجاتی ہے۔ اگر قبل از وقت مرجاتے ہیں تو پوری رقم اُن کے پسماندگان اور چھوٹے بچوں کو ملکر اُن کی پرورش کا ذریعہ ہوتی ہے۔

دستکاری کی تعلیم دینا

اس زمانہ میں طلبار کو ایک خاص قسم کی دماغی تعلیم مسلسل دس بارہ سال تک دیجاتی ہے جس کا منتہیٰ یونیورسٹی کی سند ہے۔ اگر سند نہ ملنے کے بعد فوراً خالص دماغی کام کرنے کا سلسلہ نہ پیدا ہو تو پھر ان تعلیم یافتوں کے لیے دنیا میں ایک دن کا سہارا نہیں ہوتا۔ جاہل دستکار آسانی سے دو تین روپے روزانہ پیدا کر سکتا ہے مگر گریجویٹ کوئی ایسا کام نہیں جانتا جس سے وہ اس قدر روپیہ آزادی اور آسانی سے پیدا کر سکے۔ اس نقص کو رفع کرنے کے لیے یورپ میں اور ہندوستان کے بعض بڑے شہروں میں پالی ٹکنک انسٹیٹیوٹ قایم ہورہے ہیں جن میں دماغی تعلیم کے ساتھ ہاتھوں کے استعمال کی تعلیم دیجاتی ہے اور طلبا کو مختلف قسم کی دستکاریاں اور زراعت وغیرہ سکھائی جاتی ہیں جو عملی زندگی میں انھیں کامیاب بنانے میں نہایت مدد دیتی ہیں مسلمانوں کے ذرایع معاش چونکہ محدود ہیں اور انھیں بغیر مالی امداد کے تعلیم کا زمانہ ختم کرنا مشکل ہوتا ہے اس لیے خاص طور پر مسلمانوں کے لیے مقامی مدارس میں کتابی تعلیم کے ساتھ کچھ نہ کچھ دستکاری کا انتظام کرنا چاہیے۔ جو صاحب اس بارہ میں معلومات حاصل کرنا چاہیں وہ حسب ذیل پتے پر خط و کتابت کریں۔ "پالی ٹکنک انسٹیٹیوٹ نمبر ایک نند لال بوس لین۔ باغ بازار کلکتہ"

"مہاراجہ قاسم بازار"

ناکام طلبا کو تجارت کی ترغیب دینا

مسلمانوں میں جو طلبار تعلیم پاتے ہیں وہ زیادہ تر چھوٹے عہدوں سے لیکر بڑے عہدوں تک اور محرری سے لیکر بیرسٹری تک کسی نہ کسی شکل میں

عدالتوں اور کچہریوں سے وابستہ ہو کر بسر اوقات کرتے ہیں۔ مگر واضح ہو کہ دنیا کی آبادی اور رونق
کچہری والوں سے نہیں بلکہ ان لوگوں سے ہی ہے جو صنعت و حرفت کے ذریعہ سے مال تیار کرتے اور
تجارت کے ذریعے سے اسے دنیا میں پھیلاتے ہیں۔ مال تیار کرنے اور اسے تقسیم کرنے میں اب تک
مسلمانوں کا کوئی ایسا حصہ نہیں ہے۔ جو قابل لحاظ ہو۔ انہیں سے جو نوجوان ملازمتیں پانے
میں کامیاب نہیں ہوتے وہ اپنے کو برباد سمجھ کر بیکار زندگی بسر کرتے ہیں۔ پس وہ نوجوان جو معقول
ملازمتیں پانے میں کامیاب نہوں تجارت گاہوں بازاروں اور منڈیوں میں جن پر نسبتاً کم تعلیم یافتہ
اشخاص قابض ہیں، قسمت آزمائی کریں۔ اور اس ارشاد نبوی کی کہ "لازم پکڑو تم تجارت کو کیونکہ
اس میں معاش کا ۹/۱۰ حصہ ہے" تعمیل کر کے تجارت اور سرمایہ پر حصہ رسد قبضہ کریں۔ اوپر مذکور
ہوا ہے کہ صدہا سال پہلے، سائنس اور ایجادات میں مسلمان سب قوموں سے آگے تھے مگر ایجادات
کو دنیا میں پھیلانے والی شے جس کا نام سرمایہ ہے رکھنے اور بڑھانے سے مسلمانوں کو نفرت تھی اسلیے
ان کے موجد اور محقق اپنی ایجادوں کو اپنے ساتھ قبر میں لیگئے۔ اب بھی ان میں بڑے بڑے صناع
موجود ہیں کم و بیش جدید تعلیم یافتہ ہیں، اپنی قومی زبان کے بڑے بڑے ادیب، مورخ اور شاعر ہیں
جسمانی قوت کے اعتبار سے بعض اقطاع ملک میں دوسروں سے بدرجہا بڑھے ہوئے ہیں
تاہم مجموعی طور پر کل قوم کی ناک میں نسبتاً ان پڑھ سرمایہ داروں کی نکیل پڑی ہے۔ اس سے رہائی
اور نجات دلانا اگر کسی کے ہاتھ میں ہے تو وہ ہمارے نوجوان ہیں جن کے جسم خدا کے فضل سے
تندرست اور مضبوط اور جن کے دماغ علم کی روشنی سے منور ہیں۔ حسن اتفاق سے اس ملک کے
مسلمان اس قوم سے وابستہ ہیں جو مہاجنی، زر کے کاروبار، اور حساب کتاب رکھنے میں
یگانہ روز ہیں، جن کا پایہ تخت تمام دنیا کے کاروبار کا مرکز ہے اور جنہوں نے اس ملک کی سلطنت
اول تجارت اور کاروبار کے ذریعہ حاصل کی تھی۔ پس ہماری قوم کے نوجوانوں کو بہترین موقع
حاصل ہیں کہ وہ مسائل زر کی عملی تعلیم حاصل کر کے اپنی مضمحل اور پژمردہ قوم میں نئی روح پھونکیں

خاتمہ

مندرجہ بالا امور بطور مشورہ کے عرض کیے گئے ہیں۔ اگر خوش نصیبی سے

اعلیٰ قابلیت رکھنے والے اصحاب اس طرف توجہ فرمائیں گے تو بہت سے بہتر طریقے تجویز کرکے
ان پر عمل درآمد کر سکیں گے۔ البتہ ختم کرنے سے قبل عرض ہے کہ اس رسالہ کو آنحضرت صلعم کی حدیث
"علیکم بالتجارۃ فان فیہا تسعۃ اعشار الرزق" سے شروع کیا گیا تھا۔
چونکہ مسلمانوں میں عام طور پر تجارت کا رواج نہیں ہے اس لیے ممکن ہے کہ کسی کے دل میں
یہ خدشہ گزرا ہو کہ نو آدمیوں میں سے دس آدمیوں کا پیشہ تجارت کس طرح ہو سکتا ہے۔ مگر
حسن اتفاق سے آج ۱۴ اپریل سنہ ۱۹۲۰ء کے ہمدم کے پرچہ میں جناب مولانا سلیمان صاحب
ندوی کا، جو خلافت ڈیپوٹیشن کے ساتھ آج کل انگلستان تشریف رکھتے ہیں، ایک مراسلہ
میری نظر سے گزرا جس سے حدیث مذکور کی کامل تصدیق ہوتی ہے۔ اس کے حسب ذیل اقتباس
سے واضح ہوگا کہ اس وقت آگے بڑھنے والی دنیا میں تجارت اور سرمایہ کا کس حد تک غلبہ ہے
اور مسلمانوں اس سے علیحدگی سے کس قدر شدید نقصانات اٹھا رہے ہیں۔ وہ اقتباس
یہ ہے:-

"یورپ کی کیفیت آپ مختصر لفظوں میں پوچھتے ہیں تو صرف ایک لفظ میں اس کو
ادا کر سکتا ہوں "تجارت" یہاں کا علم و فن، اخلاق، سیاست، حسن و جمال، تجارت
اور محض تجارت ہے۔ یہاں کی محبت و عداوت، خدا کے لیے نہیں ہے سلطنت کے لیے نہیں
ہے، تجارت کے لیے ہے۔ اب اس تجارت کے مختلف مظاہر ہیں حصول منافع تجارت کیلئے
بندرگاہوں کی ہوس ہے۔ بیوقوف خریداروں کی ضرورت ہے۔ یہ ضرورت کبھی مذہبی تعصب
کبھی قومی عداوت، کبھی سیاسی سازش پر آمادہ کرتی ہے قسطنطنیہ سے ترکوں کو نکال دینا چاہیئے
کیوں؟ اس لیے کہ یورپ و ایشیا کی کنجی قسطنطنیہ ہے۔ سمرنا ترکوں سے لے لینا چاہیے کیوں؟
اس لیے کہ ایشیائے کوچک کا بہترین بندرگاہ ہے۔ [illegible] چھین لینا چاہیے کیوں؟ اس لیے کہ
. . . . وہ بھی مشرق کا بندرگاہ ہے . . . . یہاں جو کچھ ہے اور ہو رہا ہے اس کا مختصر نقشہ یہ ہے کہ یہ بھی ایک قسم کی

تجارت ہے۔ ارمنوں اور یونانیوں نے لاکھوں روپیہ خرچ کرکے تمام یورپ میں ترکوں کے مظالم
کی داستان پھیلا دی ہے اور مضمون نگار ان کے قبضہ میں ہیں۔ اگر آپ ان کو توڑنا چاہیں تو آپ
بھی بزور زر اپنا نظام عمل پھیلائیے۔ مضمون نگاروں کو روپیہ دیجیے، اخباروں کو اجرت دیجیے
پبلک مقرروں کو دعوت دیجیے اور عام ہوا خواہوں کا جتھا بنائیے۔ وہ پارلیمنٹ کے ممبروں کو
ہموار کرے گا جو ہمارے کونسل کے ممبروں کی طرح اپنی ممبری کی بقا کی خاطر رفتار جمہور کی ہو کے
ساتھ چلتے ہیں۔"

اس اقتباس سے صاف ظاہر ہو گیا کہ مسلمانوں کی دنیا میں بربادی اور تباہی کی ذمہ داری نہ
دوسروں کے قومی تعصب پر ہے اور نہ ان کی مذہبی خصومت پر ہے بلکہ خود مسلمانوں کی غفلت
اور تجارت سے پہلو تہی کرنے پر ہے۔ اور اب بھی اگر تجارت اور سرمایہ کے سیلاب کا مقابلہ
ہو سکتا ہے تو صرف سرمایہ سے ہو سکتا ہے نہ کہ اپنے پاک مذہب کو تجارت کے سیلاب کے
مقابلہ میں لانے سے جبکہ مسلسل تجربہ سے ثابت ہو چکا کہ اس زمانہ میں مذہب کو دنیوی
ترقی حاصل کرنے کا آلہ بنانے میں ہمیں کامیابی نہیں ہوتی بلکہ روز افزوں بدتر حالت ہوتی
جاتی ہے تو مناسب ہے کہ اب اس کے مزید تجربے کرنے اور اپنے پاک مذہب کو تختۂ مشق
بنا کر اس پر دھبہ نہ لگائیں۔ بت پرست، انسان پرست، اور اوہام پرست قومیں، قوانین
فطرت پر عمل کرکے عِبَادِیَ الصّٰلِحُوْن اور خلیفۃ الارض بن رہی ہیں۔ اس کے مقابلہ
میں خالص اور پاک توحید ماننے والی قوم ان قوانین فطرت کی، جن کی حقیقت آیۂ شریفہ
"فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ" میں مذکور ہے، خلاف ورزی
کرکے، گداگری، اور ارتکاب جرائم میں بعض شودر اقوام سے سبقت لیے جا رہی ہے حالانکہ اس
قوم کا دعوے ہے کہ اس کا مذہب دنیوی شوکت اور اقتدار حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔
اس صریح ناکامی کی وجہ سے دوسری قوموں کو جائز طور پر کہنے کا موقع مل رہا ہے کہ اسلام
دنیوی ترقی کا مانع ہے۔ پس ہمیں چاہیے کہ اپنے عزیز مذہب کو اصلاح نفس اور درستی عقبیٰ پر

محدود کرکے اُسے تمام الزامات سے محفوظ رکھیں اور دنیوی ترقی کے لیے اُن کھلے ہوئے راستوں کو اختیار کریں جن پر دوسری کامیاب قومیں دوڑی چلی جارہی ہیں۔ کسی زمانہ میں یہودیوں کی نسبت کہا جاتا تھا کہ وہ اپنے کو اَبْنَاءُ اللّٰہ اور اَحِبَّاؤُہٗ یعنی خدا کی اولاد اور خدا کے دوست سمجھتے ہیں مگر مسلمانوں نے اس زمانہ میں اپنے کو قوانین فطرت کے عمل سے بالاتر قرار دیکر یہ ثابت کردیا کہ اب وہ اپنے کو خدا کے بیٹے اور اُس کے برابر کے دوست سمجھتے ہیں۔ اگر وہ ایسا نہیں سمجھتے تو پھر کونسی وجہ ہے کہ وہ دنیوی اقتدار کے حصول کے لیے وہ طریقے معیوب اور ذلیل سمجھتے ہیں جن کو اختیار کرنے سے دوسری قومیں زندگی حاصل کررہی ہیں اور جن کو ترک کرنے سے وہ خود مررہے ہیں۔ اس مرنے کی ذمہ داری ہرگز اسلامی قانون پر نہیں ہے جو صاف الفاظ میں بتاتا ہے اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ (جب تک وہ قوم اپنی صلاحیت کو نہ بدلے خدا اُس میں کسی طرح کا تغیر و تبدل نہیں کرتا) ایسا نہ ہو کہ خود اپنے ہاتھوں ایسی صورت پیدا کی جائے کہ اکبر کا یہ شعر ہم پر صادق آئے اور ہمارا انجام یہ ہو۔ شعر

کچھ خاک میں ملیں گے تو کچھ ہوں گے جزو غیر
یہ واقعہ صحیح ہے گو دلخراش ہے

خدا نہ کرے ایسا کبھی ہو لیکن اگر خدانخواستہ ایسا ہو تو اُس کی زیادہ ذمہ داری موجودہ نسل پر ہوگی۔ کیونکہ ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ سر سید اعظم نے تمام مذہبی اختلافات پر نظر کرکے مسلمانوں کے تہتر مذہبی فرقوں کے اتحاد خیال اور اتحاد عمل کے لیے یہ تجویز کیا تھا کہ اُن سب کا ایک مشترک مقصد ہو جو کامیابی کی ایک لازمی شرط ہے اور وہ مشترک مقصد **قومی ترقی** تھا۔ اس مشترک مقصد نے مسلمانوں میں اتحاد خیال اور اتحاد عمل پیدا کیا اور اتحاد عمل نے باہمی محبت، ہمدردی، یگانگت اور اکثر وہ صفات پیدا کردی تھیں جو قوموں کی ترقی کے لیے ضروری ہیں مگر حالات زمانہ نے جن کی تفصیل میں طول ہوگا،

انتشار پیدا کر دیا۔ تاہم مایوسی کی کوئی وجہ نہیں ہے کیونکہ سرسید کی مجوزہ شاہراہ ہمارے سامنے موجود ہے۔ ہم اس پر چلکر اگر قوم کو اعلیٰ مدارج پر نہیں پہونچا سکتے تو کم سے کم اپنا مقصد بقاء قوم قرار دیکر خدا کی مدد سے اُسے فنا ہونے سے ضرور بچا سکتے ہیں۔

اَلسَّعْیُ مِنَّا وَالْاِتْمَامُ مِنَ اللّٰہِ۔

تمّت

نوٹ: صفحہ ۸۹ میں سطر ۱۴ میں امریکہ کی نسبت لکھا ہے کہ وہاں موٹروں کی اس قدر کثرت ہے کہ بحساب اوسط دو ڈھائی آدمی کے حصہ میں ایک موٹر کار آتی ہے۔ حالانکہ ۱۴ اکا اوسط صحیح ہے ناظرین درست کر لیں۔

حکیم الامۃ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کا فتویٰ

یہ رسالہ مطبع میں پہونچ گیا تھا کہ میری نظر سے حسن العزیز کی جلد ۵ نمبرہ گزری جو ابھی موصول ہوئی ہے۔ اُس کے صفحہ ۲۲ پر ڈاکخانہ کے سود کے متعلق حضرت کا حسب ذیل ارشاد تحریر ہے: "اوّل تو بنک میں (روپیہ) جمع نہ کرنا چاہیے لیکن اگر جمع کر دیا تو یہ بہتر ہے کہ جو نفع وہاں سے ملے اُس کو لیکر مساکین کو دیدے اور اس اطلاع کی ضرورت نہیں کہ یہ سود کا ہے اور اگر کوئی شخص خود ہی مسکین اور قرضدار ہے تو بعض علماء کے نزدیک اس کو اپنی حاجت میں خرچ کرنے کی بھی گنجایش ہے۔"

اس وقت نہ صرف بعض افراد قوم مقروض و مسکین ہیں بلکہ مجموعی طور پر کل قوم دیگر اقوام دنیا کے مقابلہ میں حد درجہ مقروض و مسکین ہے اور کل قوم کی قرضداری اور مسکنت دور کرنے کا یہی ذریعہ ہے کہ پس انداز کیا ہوا روپیہ اور اُس کا منافع ذاتی اور قومی اور ملکی کاموں میں لگے بس حضرت کا یہ فتویٰ قوم کے حق میں آب حیات کا کام دیگا۔

اس اخبار یا رسالہ کی جس میں ان خیالات کی اشاعت ہو ایک جلد میرے پاس قیمتاً یا بلا قیمت جیسی کہ صورت ہو بھیجکر ممنون فرمائیں۔ مذکورہ بالا کتب کی فہرست یہ ہے:-

۱۔ علم المعیشت۔ مصنفہ مولوی محمد الیاس صاحب برنی۔ ایم اے۔ ایل۔ ایل۔ بی پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد دکن قیمت سے

۲۔ مسئلہ سود و تجارت قومی۔ مرتبہ دفتر وطن لاہور قیمت ۱۰؍

۳۔ مسئلہ سود پر علماء مصر کی بحث۔ ترجمہ مولوی محمد نذیر صاحب مولوی فاضل مطبوعہ خادم التعلیم اسٹیم پریس لاہور قیمت عہ؍

۴۔ روض الربیٰ فی حقیقۃ الربوا۔ مصنفہ مولوی محمد حسن صاحب فیضی متوطن بہین ضلع جہلم مطبوعہ خادم التعلیم اسٹیم پریس لاہور قیمت ۸؍

۵۔ رسالہ جواز سود۔ مصنفہ مولوی محمد عبد الصمد صاحب متوطن بلند شہر قیمت ۳؍

۶۔ نوٹ کے متعلق سب مسائل۔ مصنفہ مولوی مفتی احمد رضا خاں صاحب بریلوی قیمت

۷۔ فتاوی عزیزی۔ مطبوعہ مطبع مجتبائی۔ دہلی

۸۔ صحیفہ حرمت ربوا مدونہ مولوی محمد نظام الدین حسن صاحب بی اے۔ ایل ایل بی نیوتنوی۔ وکیل لکھنو۔ بلا قیمت۔

۹۔ تاریخ سود انگریزی۔ مصنفہ آنریبل خواجہ غلام الثقلین صاحب مرحوم متوطن پانی پت جو دفتر وطن سے مل سکتی ہے۔ قیمت تخمیناً عہ؍

۱۰۔ علماء دین سے استفتا اور عقلاء دنیا سے استدعا۔ مصنفہ مولوی محمد ناظر حسن صاحب نعمانی دیوبندی۔ مدرس اول مدرسہ عالیہ کلکتہ۔

۱۱۔ مضامین نسبت اصلاح محمڈن سوسائٹی بزبان انگریزی مصنفہ

دلاور حسین احمد بی اے کلکتہ۔ مطبوعہ تھیکر اسپنک اینڈ کو۔ کلکتہ

اس رسالہ میں میں نے مسلمانوں کے ماضی اور حال پر نظر کرکے اور اُن کے اندیشناک مستقبل کا اندازہ کرکے آئندہ کے لیے چند تدابیر عرض کی ہیں جو غور و بحث کی محتاج ہیں۔ اب ارکان اور بزرگان قوم کی خدمت میں عرض ہی کہ اس اہم مسئلہ پرجس پر کہ مسلمانوں کی بقا کا انحصار ہی توجہ فرماکر جس صورت میں مناسب سمجھیں اظہار خیال فرمائیں اور مسلمانوں کی قومی زندگی کے لیے کوئی دستور العمل قرار دیکر اپنے حلقۂ اثر میں اس کی اشاعت اور اُس پر عملدرآمد کی کوشش فرمائیں۔ اس امر کی ہرگز ضرورت نہیں کہ اول کل ملک کے لیے کوئی مرکز قایم کرکے وسیع پیمانہ پر کام کیا جائے بلکہ جس قدر محدود دائرہ میں مقامی کام کیے جائینگے اُسی قدر کامیابی کا زیادہ امکان ہوگا۔

طفیل احمد منو وطن منگلور ضلع سہارنپور

ولایت منزل علیگڈھ۔ یکم مئی سنہ ۱۹۲۰ء

Nizamuddin Khan

اطلاع

رسالہ ہذا انیجر نظامی پریس بدایوں یا ڈپوٹی بک ڈپو مدرسۃ العلوم علی گڈھ سے مل سکتا ہی جو صاحب جس قدر جلدیں چاہیں طلب فرمائیں۔ قیمت قسم اول فی جلد ۱۲ر قسم دوم ۸ر علاوہ محصول ڈاک۔